بسم اللہ

نگار

جلد ۱۲ فہرستِ مضامین ماہِ ستمبر ۱۹۳۰ء شمارہ ۳

ملاحظات	۲	باب المراسلة والمناظرہ	۷۶
قرآن کے لطائف ادبیہ (عبدالمالک آروی)	۹	باب الاستفسار	۷۹
علامہ آصفی نظامی (خان امتیاز علی)	۲۳	محبت (نظم) سید علی اختر۔ اختر	۸۶
ایک تصویر کی قیمت (ظفر قریشی)	۳۹	سرود نیم شبی (شیمی بی اے)	۸۸
دنیا کو مذہب کی ضرورت ہے یا نہیں	۴۹	یاد ایام (آئین حزیں)	۸۹
نظامی گنجوی کا نایاب و گمشدہ دیوان	۶۵	غزلیات..........	۹۰
زخم دل (شیر محمد اصلاحی)	۷۲	مطبوعاتِ موصولہ..........	۹۴-۹۶

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۱۸　　ستمبر ۱۹۳۲ء　　شمارہ ۳

ملاحظات

جس طرح جلدی بیماریاں دو قسم کی ہوا کرتی ہیں، لازم و متعدی اسی طرح دماغی بیماریوں کی بھی دو قسمیں ہیں لازم کی صورت یہ ہے کہ ایک شخص اپنے آپ کو غور و فکر کا اہل نہ سمجھے اور متعدی یہ کہ دوسروں کو بھی نہ سوچنے دے۔

یہ دماغی بیماری مذہب کے غلو اور مذہبی جماعت کی عدم صلاحیت نے پیدا کی اور جس وقت تک ناحق کوش علماء مذہب کا وجود باقی ہے، دنیا کبھی امن و سکون سے آشنا نہیں ہو سکتی۔

اسلام نے ایمان و اعتقاد کو دو چیزوں پر منحصر کیا ہے:- تصدیق بالجنان و اقرار باللسان۔ یعنی ضمیر کا اطمینان اور اس کا زبان سے اقرار۔ ظاہر ہے کہ جب تک نفس مطمئن نہ ہو گا، ایمان و اعتقاد میں استحکام و رسوخ پیدا ہونا ممکن نہیں۔ اور جب یہ نقش اچھی طرح دلنشیں ہو جائے گا، تو زبان سے اسکا اقرار، اور گفتگو کے ذریعہ سے اس کا اظہار بھی ایک اثر پیدا کرے گا۔ اس اطمینان نفس و ضمیر کا ذکر قرآن میں اکثر جگہ آیا ہے۔ یہانتک کہ جب ایک پیغمبر نے خدا کے مشاہدہ عینی کی خواہش کی تو اس کا سبب بھی یہی اطمینان قلب بتایا گیا۔ ہر چند اب دنیا اس منزل میں نہیں ہے۔ کہ وجود باری پر یقین لانے کے لئے وہ رویت ظاہری کو ضروری قرار دے، تاہم ریب و شک، وہم و ظن، اشتباہ والتباس کی کارگاہ ہنوز قائم ہے۔ اور غالباً زیادہ وسعت و فراوانی کے ساتھ، زیادہ اُلجھن اور پیچیدگی لئے ہوئے۔ پھر یہ

کسقدر عجیب و غریب ذہنیت انسانی ہے کہ ایک طرف تو اس روایت کی بھی تصدیق کیجاتی ہے کہ ایک شخص کے اطمینان قلب کے لئے خدا نے اپنے آپ کو بے حجاب و بے نقاب کر دیا، اور دوسری طرف اس کی بھی اجازت نہیں دیجاتی کہ ہم ان جانشینانِ رسول سے صرف یہ سوال کر سکیں کہ وہ کس استحقاق کی بنا پر اپنے آپ کو حامل دین متین سمجھتے ہیں اور وہ دین متین کیا ہے جو فطرتِ انسانی کو مطمئن کر سکتا ہے۔

دنیا کا تنہا فطری مذہب ہمکو ہر ہر موقعہ پر غور و فکر، تامل و تدبر کی تعلیم دیتا ہے، وہ ہمکو بتاتا ہے کہ مذہب کی اصل روح، نظام عالم پر غور کرنا، کائنات اور اس کے مظاہر و آثار کو دیدۂ نقد و اعتبار سے دیکھنا ہے، لیکن یہ مذہب کا علمبردار آج دنیا کو یہ درس دے رہا ہے کہ تعلیم کی تکمیل ہو چکی، دین درجۂ کمال کو پہونچگیا۔ اور وہ تعلیم وہی ہے جو وہ بتاتا ہے، وہ دین وہی ہے جسے وہ اپنے اسوۂ بلند میں ظاہر کرتا ہے۔ یہ بالکل درست ہے کہ اخلاقیات کا انتہائی درس جو دیا جا سکتا تھا، دیا جا چکا ہے، اور اب دنیا کو کسی مذہب کی ضرورت نہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا وہ اس حقیقت کو اپنے کسی عمل، کسی قول، کسی حجت و دلیل سے ثابت کر سکتا ہے؟ کیا وہ اپنے اس دعوے سے دنیا کو مطمئن کر سکتا ہے؟

دنیا کی ترقی کے ساتھ ساتھ عقل انسانی بھی ترقی کر رہی ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ اس ترقی کی حد کیا ہو گی؟ لیکن یہ مذہب کی حمایت کے لئے تڑپنے والا ابتک یہی درس دے رہا ہے کہ مذہب نام ہے بے عقلی و ہرزہ کاری کا، دین نام ہے صرف احمقانہ تقلید و اتباع کا اور زبان سے ہر اُس امر کے اقرار کر لینے کا جس پر دل کسی طرح مطمئن نہو اس تبلیغ کا نام اس نے "اعلاء کلمۃ الحق" اور "امر بالمعروف" رکھ چھوڑا ہے۔ درآنحالیکہ اس سے زیادہ توہین و تذلیل اسلام اور اس سے زیادہ اشاعت کفر و الحاد کسی اور طرح ممکن ہی نہیں۔

وہ زمانہ گیا جب علیین و سجین کے ہفت طبقات کی تعیین، کوثر و سلسبیل کی روانی اور آتش دوزخ کی شعلہ فشانی کے ذکر سے وہ اپنی ہمہ دانی کی ہیبت جاہلوں پر طاری کر دیا کرتا تھا۔ اب زمانہ ہے علوم و فنون کی ترقی کا، انکشاف حقائق کا، استقراء و مشاہدہ کا، اور اس لئے ٹھیک اُسوقت جبکہ وہ میز پر بیٹھکر معجزہ و کرامات کا ذکر کرتا ہوتا ہے، صاحبانِ عقل و دانش اس پر ہنستے ہوتے ہیں، اور جس اُصول کو پیش کر کے وہ اسلام کی طرف بلاتا ہے، اسے دیکھ کر لوگ اور اس سے ہٹتے جاتے ہیں۔ حالانکہ موجودہ زمانہ سے بہتر زمانہ تعلیم حق و صداقت کے لئے اور کوئی نہیں ہو سکتا، اگر واقعی سچ کو سچ کی طرح پیش کیا جائے۔ کیونکہ دنیا سے مذہب اُٹھ چکا ہے اور رسم و رواج کی حکومت اب اعتقادات کی دنیا میں قائم نہیں رہی۔ پھر اگر کوئی اس دورِ ذہنیت میں واقعی صحیح اصول اخلاق کے پیش کرے جو عین مدعا کسی مذہب کا ہو سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ دنیا اسے قبول نہ کرے۔ کہا جاتا ہے کہ اس ہنگامۂ مادیات میں جبکہ انسان صرف ایک "مکانکی" چیز ہو کر رہگیا ہے، روح کا اضطرار سکون کا طلبگار ہے، جسے اخلاقی یا تمدنی اصطلاح میں "دنیا کا امن" کہا جاتا ہے۔ غالباً مبلغین مذہب کو اسکا علم نہ ہوگا کہ وہی چیز جسے دنیا کا امن و سکون کہا جاتا ہے، اسکے لئے مذہب میں ایک نہایت

ہی جامع و پُر معنی لفظ "صراطِ مستقیم" کا استعمال کیا گیا ہے، جس کو زبان سے تو ہزار بار ادا کیا جاتا ہے، لیکن اس کے مفہوم پر ایک مرتبہ بھی غور نہیں کیا جاتا،

جس طرح دو نقطوں کے درمیان خطِ مستقیم صرف ایک ہی ہو سکتا ہے، اسی طرح دنیا میں اُس منزل تک پہونچنے کے لئے بھی جو ارتقاء انسانیت کا نصب العین ہے، ایک ہی راستہ ہو سکتا ہے، اور یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ راستہ وہی ہے جسے اسلام نے بتایا اور جو تمام نوعِ انسانی کو بلا تفریق نسل و قومیت بلا امتیاز ملک و ملت، یکساں طور پر دعوت دیتا ہے۔ لیکن کیا اسلام کی یہ صلح کل تعلیم، یہ ہمہ گیر درس اخلاق و عمل آج بھی باقی ہے؟ اس کا جواب ان کلید برداران فردوس سے چاہو، اُن اجارہ دارانِ خلد سے طلب کرو اور ان قائدین اسلام و رہنمائے ملت حنیفی سے دریافت کرو، جن کے یہاں اخلاق اسلامی نام ہے صرف ایک خاص وضع و صورت کا ایک مخصوص رسم و رواج کا اور جو آفرینش انسان کی حقیقی غایت حور و قصور اور کوثر و سلسبیل کے حصول کے سوا کسی اور چیز کو نہیں سمجھتا، پھر وہ لوگ جو خدا کے وجود کے ساتھ مخصوص انداز کی عبادت کو بھی ضروری سمجھتے ہیں، کیا اُن سے میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ یہ سب کس مقصد کے حصول کے لئے ہے۔ اگر اس سے مدعا وہی ہے جو ابھی عرض کیا گیا تو خیر، ورنہ از راہ کرم مجھے بتائیں کہ کلام پاک میں "لکل امۃ جعلنا منسکا ھم ناسکوہ فلا ینازعنک فی الامر" کا کیا مفہوم ہے۔ اور "لکل امۃ جعلنا منسکا لیذکروا اسم اللہ" سے کیا مراد ہے۔ کیا عبادت و منسک ایک ہی چیز ہیں، کیا نماز اور منسک ایک ہی مفہوم کے دو لفظ ہیں؟

اسوقت دنیا اس اعلان کے لئے گوش بر آواز ہے جو شملہ کی چوٹی سے سنایا جانیوالا ہے اور جس پر ہندوستان کی سیاسیات کا مستقبل بڑی حد تک منحصر ہے۔ آج ۲۶ اگست تک سوائے اسکے کوئی اہم خبر موصول نہیں ہوئی کہ سر سپرو اور مسٹر جیکار شملہ پہونچکر وائسرائے سے گفتگو میں مصروف ہیں۔ اور اُن شرائط کو پیش کر چکے ہیں۔ جو ہندوستان کے زعماء سیاست کی طرف سے طے پائی ہیں۔ اخبارون نے ظن و تخمین سے کام لیکر بڑی حد تک ان شرائط کی تصریح بھی کر دی ہے اور ممکن ہے کہ وہ بڑی حد تک صحیح ہوں۔

اس میں شک نہیں کہ وقت و مصلحت کا اقتضاء یہی ہے کہ جس طرح ممکن ہو، موجودہ نزاع کو ملتوی کیا جائے اور گزشتہ چند ماہ کے اندر جو توازن اقتصاد و معاشرت درہم برہم ہو گیا ہے اُسے اپنے اصلی حال پر لایا جائے اس سے ایک فائدہ تو یہ ہے کہ حکومت ہند کو بھی اطمینان سے غور کرنے کا موقعہ ملے گا کہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں وہ کیونکر ہندوستان کے جذبات کی صحیح نمایندگی کر سکتی ہو اور دوسری طرف خود کارکنان قوم کو آیندہ زیادہ قوت و جوش کے ساتھ کام کرنیکا حوصلہ ہوگا۔

راؤنڈ ٹیبل کانفرنس حقیقتاً کوئی معنے نہیں رکھتی اگر کانگرس کی نمایندگی وہاں نہ ہو اس لئے قیدیوں کی آزادی

کا مسئلہ اس جگہ آکر بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ البتہ حکومت ہند کے لئے یہ وعدہ کرنا کہ وہاں ڈومی نین رُول ہی پر گفتگو ہوگی بیشک دشوار ہے۔ علی الخصوص اُسوقت جبکہ لیبر پارٹی سے بھی اس باب میں زیادہ فیاضی کی توقع نہیں کیجاتی۔ بہرحال یہ گھڑیاں بڑی فیصلہ کن گھڑیاں ہیں اور ملک کو بغیر کسی قسم کے اضمحلال کے نتیجہ کا انتظار کرنا چاہیئے۔

حال ہی میں مسلمانوں نے پھر اُسی عجیب و غریب چیز میں روح پھونکنا چاہی ہے جو اس سے قبل بھی اسی تنظیم کانفرنس کے نام سے قائم ہوئی تھی۔ اس کے ناشرین میں سے فی الحال سب سے زیادہ اہم ہستیاں جناب ماجد بدایونی اور شوکت علی کی ہیں، جو بدقسمتی سے دونوں مولانا ہیں، ایک بہ لحاظ اپنے جبہ و عمامہ کے اور دوسرے بہ حیثیت اپنے شحم و لحم کے تنظیم کانفرنس کا نتیجہ کیا ہوگا، اس کے ذریعہ سے کیسی کیسی اہم خدمات انجام دیجائیں گی۔ اسکا جواب زیادہ دشوار نہیں۔ ایک انسان کے ماضی کو دیکھ لو مستقبل آپ سامنے آجائے گا۔ جنھوں نے انجمن تبلیغ میں اور جمعیۃ العلماء کے جلسوں میں جناب بدایونی کے کارنامے دیکھے ہیں اور جنھوں نے خلافت کی تحریک میں شوکت علی صاحب کی کارگزاریوں کا مطالعہ کیا ہے وہ بہ آسانی نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ تنظیم کانفرنس کا کیا حشر ہوگا اور وہ ملک و قوم کی دشواریوں میں کتنی آسانیاں پیدا کرے گی۔

اول اول جسوقت مسٹر کچلو نے اس کانفرنس کی بنیاد رکھی تو یہی شوکت علی تھے، جنھوں نے اس کی مخالفت کی تھی اور اب بھی اپنے تمام "ابعاد ثلثہ" کے ساتھ وہی شوکت علی ہیں جو اس کو اصل کار اور "کعبہ مراد" بتا رہے ہیں۔ اس بوالعجبی کا اظہار ایسی ہستیوں سے مستبعد نہیں ہیں، کیونکہ ان حضرات کو نہ قوم و ملک سے کوئی صحیح تعلق ہے، نہ مذہب و انسانیت سے۔ یہ وہ بندگان ہوس و غرض ہیں جنھوں نے ہمیشہ یہی کیا اور کرتے رہیں گے۔ البتہ امتداد زمانہ سے اتنا انقلاب ضرور ہوا ہے کہ لوگ پہلے ان سے واقف نہ تھے اور اب کچھ حقیقت آشنا ہو چلے ہیں۔

جسوقت سید جالب اڈیٹر ہمت کا انتقال ہوا میں حیدرآباد میں تھا۔ یہاں آنیکے بعد مجھے صرف ایک یا دو ماہ کے ملاحظات میں اس واقعہ کے اظہار کا موقعہ ملا، لیکن وہ "قیام الدین" اور اُس کے متعلقات کے نذر ہوگئے۔ تاہم میں نے یہاں کے ایک مقامی روزانہ اخبار میں، اپنے خیالات بغرض اشاعت روانہ کردئے تھے جنھیں اُس نے کسی مصلحت کی بنا پر شائع نہیں کیا۔ بہرحال اب میں اس تعویق پر عذر پیش کرتے ہوئے سید جالب کی وفات پر اظہار ملال کرتا ہوں، اور یقیناً اس سانحہ کو اُردو صحافت کا سخت حادثہ سمجھتا ہوں۔

سید جالب نہ صرف ایک صحافی بلکہ ایک انسان ہونے کے لحاظ سے بھی عجیب و غریب چیز تھے۔ مجھے اول اول سنہ ۱۴ء میں اُن سے دہلی میں ملنے کا فخر حاصل ہوا تھا، جب میں اُنکے مکان کے سامنے ہی رہا کرتا تھا۔ وہ دہلی کی قدیم تہذیب و شائستگی کے یادگار تھے، اور حقیقت یہ ہے کہ شرافت و انسانیت کے لحاظ سے کم لوگ ایسے پائے جاتے ہیں۔ اُردو صحافت میں تجربہ اور معلومات کے لحاظ سے جو مرتبہ اُن کا تھا وہ ظاہر ہے۔ اخیر میں جب وہ ہمدم سے علحدہ ہوئے تو ہمت جاری کیا

جو ابتک قائم ہے۔ ہر چند اپنی پالیسی کے لحاظ سے وہ سید جالب کی زندگی میں بھی کبھی قابل قدر و تحسین نہیں سمجھا گیا، تاہم اُنکی شخصیت کی وجہ سے وہ کسی نہ کسی طرح چلتا رہا۔ اب چونکہ اُن کے پسماندگان نہ وہ اثر رکھتے ہیں نہ وسعتِ نظر، اس لئے بحالت موجودہ اسکا چلنا دشوار معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کا وجود ملک کے لئے نہ باعث خیر و برکت ہے نہ موجب لطف و تفریح۔ میں نے جو تجویز اس اخبار کے قائم رکھنے کیلئے پیش کی تھی وہ منظور نہیں کی گئی ورنہ شاید یہ ایک بہتر یادگار مرحوم کی ہوتا۔ بہر حال سید جالب خود بہت قابل قدر شخص تھے اور اس فقدان پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔

ہمارے عزیز دوست جناب مجنوں بی۔ اے گورکھپوری نے جن سے نگار کا حلقہ بخوبی واقف ہے۔ گورکھپور میں ایک "ایوان اشاعت" قائم کیا ہے۔ جس سے مقصود ملک میں ادب و تنقید، علم و تاریخ کا بلند ذوق پیدا کرنا ہے۔ یہ تحریک صرف اُن کی ذات سے متعلق نہیں ہے بلکہ اس کام کو وہ اجتماعی حیثیت سے انجام دینا چاہتے ہیں۔ چنانچہ گورکھپور کے بعض ارباب علم و ثروت نے اسمیں کافی دلچسپی کا اظہار کیا۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ایوانِ اشاعت کی پہلی کتاب جس میں فلسفۂ شوپنہار پر نہایت پُر لطف روشنی ڈالی گئی ہے شائع ہو چکی ہے۔ جناب مجنوں نہ صرف ایک بلند ذوق کے ادیب ہیں۔ بلکہ وہ فلسفہ کا بھی نہایت پاکیزہ مذاق رکھتے ہیں اور تنقید کی صلاحیت بھی۔ اس لئے اگر ایوان اشاعت ان کے اہتمام میں ملک و زبان کی قابل قدر خدمات انجام دے تو حیرت نہ کرنا چاہیئے۔ دوسری کتاب جو بہت جلد شائع ہونیوالی ہے وہ مثنوی زہر عشق ہے۔ جو بہترین تنقید کے ساتھ مع چند تصاویر کے نہایت اعلےٰ طباعت و کتابت کے ساتھ پیش کیجائے گی۔

میں ملک کو متوجہ کرتا ہوں کہ ایوان اشاعت کی امداد کریں اور اسکی ممبری وغیرہ کے قواعد ان سے طلب کر کے اسکو کامیاب بنانے میں ہر ممکن سعی سے کام لیں۔

جناب نسیم انہونوی مدیر انکشاف نے ارادہ کیا ہے کہ وہ لکھنؤ سے ایک نسائی رسالہ جاری کریں جو اپنے ذوق کے لحاظ سے بہت بلند و دلچسپ ہو۔ اس میں کلام نہیں کہ ملک میں نسائی رسالوں کی بہت کمی ہے، حالانکہ اس کمی کو سب سے پہلے پورا ہونا چاہیئے تھا۔ کیونکہ قوم عبارت ہے ملک کے بچوں سے اور بچوں کی تربیت منحصر ہے ملک کی ماؤں پر اسلئے حقیقی خدمت یہی ہے کہ اس طبقہ میں ذوق علم پیدا کیا جائے اور اس کی ذہنیت میں اصلاح

اس رسالہ کا نام حریم ہوگا۔ یہ وہی نام ہے جو مینے سب سے پہلے ایک زنانہ رسالہ کیلئے تجویز کیا تھا اور جس کو بیدل مرحوم کے امارت میں شائع کرنیکا ارادہ تھا۔ میں خوش ہوں کہ جناب نسیم میری اس تجویز کو بروئے کار لانے کے لئے پورے جوش کے ساتھ آمادہ ہیں اور جس حد تک اُن کی محنت و کاوش کا تعلق ہے۔ مجھے ان کی کامیابی کا بھی یقین ہے۔ اس رسالہ کی ترتیب جس نہج و اصول پر ہوگی، وہ میری ہی رائے سے طے پایا ہے اور اگر پابندی کے ساتھ اس پر عمل کیا گیا تو میں کہہ سکتا ہوں

کہ یہ ہندوستان کا پہلا رسالہ ہوگا جو حقیقی معنی میں دنیا کی اس "اہم مخلوق" کی خدمت کرنے والا ثابت ہوگا۔ یہ رسالہ غالباً نومبر کی کسی تاریخ میں شائع ہو جائے گا۔ جن حضرات کو اس سے دلچسپی ہو وہ اس کے متعلق پوری معلومات "دفتر رسالۂ حریم لکھنؤ" سے طلب کریں۔

عرصہ سے ارادہ تھا کہ فرصت ہو تو صوبہ سرحد کے اضلاع جا کر دیکھوں جہاں کے لوگوں کو نگار اور اس کے مقاصد سے اسقدر دلچسپی ہے۔ لیکن چونکہ فرصت و اسباب کا یہاں ہمیشہ فقدان رہتا ہے بنا بران اسوقت تک اس ارادہ کی تکمیل کی کوئی صورت نہ نکل سکی تھی۔

لیکن معلوم ہوتا ہے اب وقت آیا ہے کہ یہ دیرینہ آرزو پوری ہو جس کا امتیاز تمامتر جناب سردار احمد خاںصاحب سول جج پشاور اور اُن کے احباب کو حاصل ہے۔ جن کی دعوت کو رد کرنا میرے اختیار سے باہر ہے اور جن کے لطف و محبت، صدق و خلوص کا نگار ہمیشہ زیر بار رہا ہے۔

غالباً اکتوبر کے پہلے ہفتہ میں یہاں سے روانگی ہوگی اور پانچ دن پشاور میں قیام کرنے کے بعد، بنوں، کوہاٹ اور ڈیرہ اسماعیل خاں کے احباب سے ملتا ہوا آخر اکتوبر تک واپس آؤں گا۔ خدا کرے وہاں کے سیاسی اضطراب میں اُسوقت تک سکون ہو چکا ہو، لیکن نہ اس حد تک کہ سفر کی "رومانیت" ہی مفقود ہو جائے۔ میں یہاں تک لکھ چکا تھا کہ جناب مکرم سردار احمد خاںصاحب کا نامۂ گرامی پشاور سے موصول ہوا جس میں اُنھوں نے وہاں کے موجودہ عدم سکون کا ذکر کرتے ہوئے اظہار افسوس کیا ہے۔ بہرحال اگر حالات میں کوئی قابل اطمینان انقلاب پیدا ہوا تو سفر یقینی ہے۔ روانگی سے قبل میں اپنے احباب سرحد کے پاس مستقل پروگرام سفر کا بھیجدوں گا۔ تاکہ مجھے بھی ملنے میں آسانی ہو اور وہ بھی بیجا زحمت انتظار سے بچیں۔

بمبئی میں ایک جماعت حال ہی میں پیدا ہوئی ہے جو تمام مذاہب کی جماعت علمائے کے خلاف پروپگنڈا کرنا چاہتی ہے چونکہ اس کے دائرہ عمل میں بیرون ہند کے بھی تمام ممالک شامل ہیں۔ اس لئے اس کا لٹریچر انگریزی زبان میں شائع ہوا ہے۔ اور غالباً زیادہ استواری کے ساتھ کام کرنا چاہتے ہیں۔ مگر میرے پاس جو کاغذات آئے ہیں اُن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تحریک کو اُصولی طور پر چلانے کے لئے ضرورت ہے کہ وہ اپنے احاطۂ عمل کو وسیع کریں اور زیادہ واقف الحال لوگوں سے مدد چاہیں۔

بہرحال اس میں شک نہیں کہ اب دنیا کی بیزاریاں اس طبقہ کی طرف سے ناقابل برداشت حد تک پہونچ گئی ہیں۔ اور وہ وقت دور نہیں جب اُنکا بُت توڑ کر خدا کی زمین کو اُنکے ناپاک وجود سے پاک صاف کر دیا جائے گا۔

"قرآن کے لطائف ادبیہ" کا سلسلہ اکتوبر یا نومبر میں ختم ہو جائے گا۔ اسکے بعد مولوی عبدالمالک صاحب اس سے بھی زیادہ اہم مضمون شروع کرنیوالے ہیں۔ جس کی ابتدا دسمبر سے ہوگی۔ آصفی نظامی کے عقائد پر تنقید اس مہینے میں ختم ہو گئی۔ ممکن ہے بعض حضرات کو اسکی طوالت ناگوار ہوئی ہو، لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ مضمون نگار نے پوری سعی و کاوش سے اس مقالہ کو مرتب کیا۔ اور آصفی کے کلام کی داد دینے میں انھوں نے اپنے پورے اعتقاد سے کام لیا۔ تصویر کی قیمت افسانہ ہے اور پلاٹ کے لحاظ سے بہت دلچسپ۔ "مذہب کی ضرورت" اس مضمون کا عنوان ہے جسکا بہ سلسلۂ تنقید رسالہ "قیام الدین" وعدہ کیا گیا تھا۔ آئندہ ماہ میں غالباً یہ بھی ختم ہو جائے گا۔ نظامی گنجوی کے دیوان کے متعلق جناب آسی نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ غور سے پڑھنے کے قابل ہے۔ خود میں نے بھی یہ دیوان دیکھا ہے۔ لیکن میں آسی صاحب سے اس مسئلہ میں متفق نہیں ہوں کہ نظامی کی غزلیں بھی وہی مرتبہ رکھتی ہیں جو انکی مثنوی کا ہے۔

زخم دل آسکر وائلڈ کے ایک افسانہ کا ترجمہ۔ انگریزی میں اس رنگ کے افسانے استعاری (ALLEGORICAL) کہلاتے ہیں۔ اور آسکر وائلڈ اس رنگ کے فسانے خوب لکھتا تھا۔ اردو میں بھی اول اول اس کا تتبع بعض حضرات نے کیا تھا، لیکن شاید زیادہ کامیابی کے ساتھ نہیں۔ آسکر وائلڈ کا یہ فسانہ بھی سابق دو فسانوں کی طرح اشتراکیت کے ان اصول پر قائم ہے۔ جنھوں نے اب روس میں کمیونزم کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اس بار باب الاستفسار بالکل تاریخی ہے اور یقین ہے کہ دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائے گا۔ نظموں میں مولوی سید علی اختر اختر کی نظم محبت کے عنوان سے بہت دلچسپ و پُر مغز ہے حقیقت یہ ہے کہ اختر صاحب خوب سوچتے ہیں خوب لکھتے ہیں، اور ممکن ہے کہ یہ نتیجہ ہو "اس بوئے جانفزا" کا جسکی فضا میں وہ ہر وقت سانس لیتے رہتے ہیں۔ خاقانی کی طرح تیس سال کے بعد مجھے بھی یہ آج ہی معلوم ہوا ہے کہ بہ "ذوق این مے نہ شناسی بخدا تا نہ چشی" کا اصل مفہوم کیا ہے۔

ملیریا کا زمانہ ہے اور ہر شخص اپنی جگہ پریشان۔ نگار کا کاتب، پریس کا مشین مین، اور دفتر کے کام کرنیوالے تقریباً سبھی مبتلا ہیں۔ اور نہیں کہا جا سکتا کہ مجھے کس وقت اس کا خیر مقدم کرنا پڑے۔ بیگم نے کل ابتدا کر ہی دی ہے اور اسوقت ۱۰۴ ڈگری سے زیادہ تپ موجود ہے۔ یہ میں نے اس لئے عرض کیا کہ اگر اکتوبر کا نگار دو چار دن کی تعویق سے شائع ہو تو اسکو ان طبیعی حوادث پر محمول کرنا چاہیئے۔

رسالہ جن کی اشاعت بھی اس قسم کے بعض اسباب سے تعویق میں آجاتی ہے اور لوگوں کو شکایت ہوتی ہے۔

آئندہ سے نگار نہ پہونچنے کی اطلاع ۲۰ تک اور جن کی ۲۵ تک آنا چاہیئے۔

قرآن کے لطائف ادبیہ

(بہ سلسلۂ سابق)

میکڈانلڈ کے نظریات پر محاکمہ

ایک عیسائی عالم سے اس کے سوا اور امید ہی کیا ہوسکتی تھی کہ وہ محمدؐ کو قرآن مجید کا مصنف قرار دے۔ یہ کوئی نیا واقعہ نہیں، جارج سیل، پامر، نکلسن وغیرہ نے یہی خیال ظاہر کیا ہے، مجھے یہاں اس مسئلہ پر بحث کرنا نہیں کہ قرآن مجید کا مصنف غیر متمدن عرب کا ایک امی صحرانشین تھا، یا کوئی باطنی طاقت، بلکہ یہاں اس مسئلہ پر روشنی ڈالنا ہے، کہ قرآن مجید کے اسلوب انشا میں سجع کا لحاظ کیوں رکھا گیا ہے؟ اور یہ کہ میکڈانلڈ کی وہ تمام کوشش جو انہوں نے ایک کاہن اور آنحضرت کا مقابلہ کرنے میں صرف کی ہے، کسی حد تک اہمیت بھی رکھتی ہے یا نہیں؟

مصنف موصوف کی ذاتی تحقیق ہے، کہ عربی شاعری میں "سجع" کا رواج قدیم زمانہ سے چلا آتا ہے، نہیں معلوم میکڈانلڈ نے یہ کہاں سے لکھدیا اول تو نثر میں جاہلی ادبا کا کوئی ایسا کارنامہ ہی موجود نہیں، جسے صحیح معنی میں "سجع" کہہ سکیں، "سجع" اور "نثر فنی" کے متعلق "المجمل فی تاریخ الادب العربی" میں جو واقعات ملتے ہیں اُن سے میکڈانلڈ کے نظریہ کی تصدیق نہیں ہوتی ہے۔

وہ نثر فنی جو رسائل، جغرافیہ، تاریخ، قصص، اور سیرت کی کتابوں میں استعمال ہوتی تھی، اُس کا ایک مقصد تو یہ تھا کہ خیال کی نقش طرازی اور وجدان و شعور کے حرکات کی توضیح کیجائے یا قدرت کلام (براعۃ القول) میں تفوق اور صنعت لفظی میں دستگاہ رکھنے کا اظہار کیا جائے، یہ نثر فنی چوتھی صدی ہجری میں مروج تھی، اس کے بعد محاسن معنوی کی بجائے رعایت لفظی کی طرف لوگوں کا رجحان ہوگیا اور نثر میں "سجع" کا رواج ہوا جسکو چھوٹے چھوٹے فقرے مستلزم ہوتے ہیں اور شرح و استدلال میں کثرت سے اسالیب شعریہ، تخیلات، تشبیہات اور استعارات بدیعہ سے کام لیا جانے لگا، معانی کا اختراع کم ہوگیا، ایک ادیب اشعار کے معانی جمیل کی شرح و بسط اور قرآن و حدیث اور امثال سے لفظی و معنوی اقتباس کیطرف رغبت کرنے لگا، یہاں تک کہ ادبا اپنی خاص اصطلاح میں اس ادبی صنف کلام کو "شعر منثور" سے تعبیر کرنے لگے، اور پہلے پہل جس شخص نے اس طریقہ کا رواج دیا ابن عمید (وزیر آل بویہ تھا) تھا اور اُسکے اکثر معاصرین اور اس کے بعد والے ادیبوں نے اسکی پیروی کی اس صنف کلام کا سب سے بڑا نمونہ "مقامات حریری" ہے۔ ابن عمید مشرق، فارس اور حلب میں اس طریق انشا کا معلم اول گزرا ہے، باوجود اسکے کہ شعر منثور کا وہ امام تھا لیکن فن بلاغت میں اس کی انشاپردازی کا کوئی نمونہ نہیں پایا جاتا۔ جیسا کہ متاخرین میں اسکے پیرووں کی انشاپردازی میں نظر آتا ہے، کہا جاتا ہے کہ انشا کی ابتدا عبدالحمید سے ہوئی۔ اور ابن عمید پر اسکا خاتمہ ہوگیا، اس نے سنہ ۳۶۰ھ میں وفات پائی اس طریقہ کے سب سے بڑے انشاپرداز نہیں

بدیع الزماں ہے، جس کے اشعار کا ایک دیوان، مقامات اور دیوان رسائل چھپکر شائع ہوگیا ہے، دوسرا خوارزمی ہے، جسکے رسائل کا ایک دیوان طبع ہوچکا ہے، تیسرا الثعالبی ہے، جسکے رسائل کا ایک دیوان ہے، اور اسکی پہلی جلد چھپ کر شائع ہوچکی ہے، چوتھا حریری ہے، جو مقامات (مشہور کتاب) کا مصنف ہے، اور جو مختلف صورتوں میں طبع ہوچکی ہے، اور اسکی متعدد شرحیں لکھی گئی ہیں۔

نثر فنی کے متعلق "المجمل" میں مفصلہ ذیل تحقیق پائی جاتی ہے۔

عہد جہالت کے اشعار کی بہت کثیر تعداد بیان کیجاتی ہے، لیکن اس کا بڑا حصہ ضائع ہوگیا، کیونکہ یہ کہیں لکھا ہوا نہ تھا اور جیوں جیوں زمانہ گزرتا گیا لوگ بھولتے گئے، اور راویوں کی موت نے بہت سا کلام کھو دیا۔

لیکن عہد جہالت کا نثر نگاری کا تو بہت ہی قلیل تذکرہ پایا جاتا ہے، اور اس حد تک قلیل کہ شعر کے مقابلہ میں اسکی تاریخ[1] بیان کرنی فضول ہے، قدما کو نثر نگاری کی بجائے شعر گوئی کا ذوق تھا، کیونکہ وزن اور قافیہ کی بدولت اشعار کے یاد کرنے اور روایت کرنے میں آسانی ہوتی ہے اور عہد جہالت کے نثر (فنی) کلام کی کمی کی وجہ جو بیان ہوئی بذات خود صحیح ہو اسکے علاوہ تاریخی حیثیت سے بھی شعر کو نثر فنی پر تقدم زمانی حاصل ہے، کیونکہ شعر کی زبان، خیال اور ذوق کی زبان ہوتی ہے، اس کے برعکس نثر نگاری میں عقل وفکر کے نتائج پیش کئے جاتے ہیں، اور یہ حقیقت عصر جاہلی کے اشعار کی کثرت اور نثر فنی کی قلت کی توجیہ ہے، ظہور اسلام تک اہل عرب اکثر امی تھے، ان پڑھ ہونے کے ساتھ شعر کا وجود ہو سکتا ہے۔ لیکن نثر فنی نہیں پائی جا سکتی۔ ہرچند یہ صحیح ہے کہ قوم عرب کے بعض افراد لکھنا پڑھنا جانتے تھے، اور وہ عصر جہالت کے اخیر زمانہ میں اپنے معاملات اختیاری میں تحریر وکتابت کا استعمال کرتے تھے، لیکن کتابت نے اس حد تک رواج نہیں پایا تھا کہ لوگ شعر وادب کی تدوین میں اس سے کام لیتے۔

میکڈانلڈ نے آغانی کے حوالہ سے، بادشاہ حجر کا واقعہ بیان کرتے ہوئے، عوف ابن ربیعہ بنو اسد کے مشہور کاہن کی جو تمثیل پیش کی ہے، اسکے لئے انھوں نے صرف انگریزی ترجمہ پر اکتفا کیا ہے، حالانکہ یہاں چاہئیے تھا کہ وہ عربی عبارت درج کرتے۔ بہرحال اگر اسلوب بیان کو بھی لے لیا جائے تو اس میں اور قرآن مجید کے لہجہ میں ایک نمایاں فرق ہے، اور عوف ہی پر موقوف نہیں۔ حماسہ میں اکثر جاہلی شعرا اسی طرح پیشینگوئی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

قرآن مجید یقیناً شروع سے آخر تک سجع میں ہے (ہرچند مصر کے علمائے جدید نے اختلاف کیا ہے، جیسا کہ "المجمل"

---

[1] اما النثر الذی یروی عن العصر الجاھلی فقلیل جدا لا یکاد یذکر الی جانب الشعر وکان القدماء یعللون قلة النثر وکثرة الشعر بان وزن الشعر وقافیه یسھلان حفظه وروایته علی حین ان حریة النثر وانطلاقه من القیود یجعلان حفظه عسیرا وروایته احسن (المجمل فی تاریخ الادب العربی)

سے واضح ہوتا ہے، لیکن میں اس نظریہ میں میکڈانلڈ کی تائید کرتا ہوں، اور المجمل کے مصنفین سے اختلاف رکھتا ہوں لیکن میں اسکے ماننے کے لئے تیار نہیں کہ یہ کاہنوں کے بیان کی تقلید اور انکی انشا کا تتبع ہے، اسمیں شک نہیں کہ سرسری مطالعہ سے قرآن مجید کی بعض مسجع عبارتوں میں وہی قوافی پائے جاتے ہیں جو جاہلی شعرا کے اشعار میں ہیں، لیکن جستجو کرنیکے بعد قرآن مجید میں ایسی آیتیں شاذ و نادر ملتی ہیں،[۱] چنانچہ اسلوب قرآنیہ کے متعلق "المجمل" میں مفصلہ ذیل مباحث ہیں۔

قرآن مجید کا اسلوب بیان عجیب غریب ہے، اور اس اسلوب سے مختلف ہے، جسے عرب اپنے نظم و نثر میں ملحوظ رکھتے تھے، قرآن مجید کے حسن تالیف، انتخاب لفظی، وجوہ اعجاز، جودت مقاطعہ، حسن تذلیل، روانی قصص، بدیعہ امثال، ان تمام (اور ان کے علاوہ اور) خوبیوں نے اسے بلاغت کے اعلیٰ درجہ پر پہونچا دیا اور اس کے اسلوب میں ایک ایسی کشش پیدا کر دی، کہ قلب بے اختیارانہ اسکی طرف کھنچنے لگتا ہے، اسکی عبارت کبھی کبھی مسجع ہوتی ہے۔ لیکن اسمیں "سجع" کا التزام نہیں پایا جاتا، کبھی کبھی اس میں وزن بھی آ جاتا ہے، لیکن اسکی پابندی نہیں (مجھے اس نظریہ سے اختلاف ہے، جیسا کہ سطور بالا میں لکھ چکا ہوں، اور آیندہ سطور میں اسکی توجیہ کر دی گئی ہے) آسانی الفاظ کے لئے قرآن ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے، اور سہولت لفظی کے ساتھ عبارت میں حلاوت اور روانی پائی جاتی ہے۔

دعوت اور تبلیغ کے لئے قرآن میں ایک خاص اسلوب ہے، اس لئے اکثر مکی سورتوں میں (جیسے ص اور ق وغیرہ) تہدید اور وعید کے متعلق چھوٹی چھوٹی آیتیں، قوی مقاطع (SYLLABLES) اور زوردار معانی پائے جاتے ہیں، اس طرح مدنی سورتوں میں (بہ استثنائے ان سورتوں کے جو غزوات کے متعلق ہیں) طویل آیتیں، اور سنجیدہ مقاطع ملتے ہیں، جن میں نرمی اور رحمت کا بیان ہوتا ہے۔

زبان عربی کی حفاظت میں قرآن مجید کا زبردست اثر ہے، اس کے بیان نے انسان کو مسحور کر لیا، لوگوں میں اس کا ذوق پیدا ہوا، لوگ اسے حفظ کرتے اس سے اقتباس کرتے اس کے واقعات بیان کرتے، اس کے اسالیب، الفاظ، اور تراکیب سے اثر پذیر ہوتے، ایک جماعت اٹھی وہ علوم (جیسے بلاغت، اور نحو) کی تدوین سے دلچسپی لینے لگی، اور انھیں قرآن مجید کے فہم اسرار کا ذریعہ قرار دیا اور جب مختلف قومیں اسلام لائیں، تو انھوں نے زبان عربی کی تعلیم کو فہم دین کا ایک وسیلہ قرار دیا، انھوں نے علم دین سمجھکر تحصیل زبان شروع کی، اور ان میں سے کثیر افراد نے اپنی زبان اور اپنے محاورے چھوڑ دئے

---

[۱] نابغہ ذبیانی کے اشعار ہیں (نابغہ عہد جاہلیت کا مشہور شاعر ہے۔)

فلما دقا جا الیہ ضوبۃ فائۃ　　وللبوعین لا تغضنا ظرہ
فقال تعالی نجعل الیہ بنیننا　　علی ما لنا او تجزی الی اخرہ
ابی لی قبر لا ینوال مقابلی　　وضوبۃ فائس وقدائس فا قرہ

ان کے مقابلہ میں قرآن مجید (سورہ قیامہ) کی مفصلہ ذیل آیتیں پڑھیئے۔
وتذرون الآخرۃ ۝ وجوہ یومئذ ناضرۃ ۝ الی ربہا ناظرۃ ۝
ووجوہ یومئذ باسرۃ ۝ تظن ان یفعل بہا فاقرۃ ۝

اور جب قوموں نے لہجہ میں اختلاف کیا، اور ہر قوم کی ایک زبان بن گئی، تو ادب و انشا کی زبان پر ایک پردہ پڑ گیا، اس معنی میں قرآن مجید کو بہت بڑا مرتبہ حاصل رہے[1]، (یعنی اسکی زبان خالص رہی اور اس نے عربی زبان کی حفاظت کی)

ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے، کہ نزول قرآن کے بعد اکثر شعرائے عرب نے عبارت قرآنی کے قوافی اور بعض وقفات اوزان میں اشعار کہے ہیں جیسا کہ "المجمل" کے مفصلہ ذیل واقعات سے پتہ چلتا ہے۔

عبیداللہ بن قیس الرقیات کے کلام میں ایک خاص قسم کی رقت لفظی پائی جاتی ہے، اور اس نے اپنے عہد کے اعتبار سے ایک انوکھے طریقہ پر سہولت الفاظ میں کوشش کی ہے، اس کے کلام میں ایسی رقت کی وجہ یہ تھی، کہ وہ عورتوں کے ساتھ حد سے زیادہ میل جول رکھا کرتا، اور خلیفہ عبدالملک نے معنوی اعتبار سے اسکے ایک قصیدہ آیتہ کو "مخنث" کہہ دیا، عبیداللہ نے اس پر احتجاج کیا کہ یہ قافیہ قرآن مجید سے متاثر ہے، اور فی الواقع شعرگوئی میں وہ قرآن مجید سے اثر پذیر ہوا ہے۔ اور اسی تاثر کا نتیجہ ہے کہ اس کے لہجہ ادا میں ایسی لینت، الفاظ میں سہولت اور عبارت میں شیرینی پائی جاتی ہے، جو اس کے ہم عصر شعراء کے کلام میں نہیں پائی جاتی،

اسی طرح عہد عباسیہ کا مشہور شاعر منصور نمری "قرآن سے استفادہ کرتا ہے۔

خلیفہ ہارون رشید" منصور نمری" کے اشعار سے ایسا ہی متاثر ہوتا تھا، جس طرح عبدالملک اخطل کے اشعار سے دلچسپی رکھتا تھا لیکن یہ بات فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ سیاسی لوگ شعر کو شعراء، علم کو علم کی حیثیت سے نہیں پسند کرتے، بلکہ وہ شعرا اور علما کو اپنے اغراض سیاسی کا آلہ بناتے ہیں۔ یہ ایک صریح بے عقلی کی بات ہوگی اگر ہم یہ گمان کریں کہ خلیفہ ہارون رشید کے دربار میں "نمری" کی عزت اور رسائی کا سبب شاعرانہ کمال تھا، یا جیسا کہ ادب عربی کے بعض مورخوں کا وہم ہے کہ خاندانی قرابت کے باعث اسے جاہ و منصب عطا ہوا تھا، بلکہ ہارون رشید نے محض اسلئے اس شاعر کو اپنی سرپرستی میں لے لیا تھا کہ آل عباس اور انکی خلافت سے اسے قلبی لگاؤ تھا اور آل علیؑ ابن ابی طالبؑ سے وہ نفرت رکھتا تھا، جن کا وجود اور اثر

---

[1] چنانچہ علوم فقہ و حدیث کے حامل ابوحنیفہ، امام بخاری، مسلم، ادب و فلسفہ کے ماہر ابن مقفع، کسائی، جاحظ، ابن قلیبہ، سیبویہ، ابن الرومی (جنہوں نے عربی زبان کی ترقی میں ایک ایسا حصہ لیا)، تمام عجمی تھے، ابن الرومی عہد عباسیہ کا ایک بہت بڑا عربی شاعر خیال کیا جاتا ہے، وہ یونانی الاصل تھا لیکن عربی ادب میں اسے ایسی مہارت تھی کہ اسے اُستاد فن کہتے ہیں، مسلم بن ولید (شاعر) انصار کے ایک غلام تھے، ابوالعتاہیہ، بشار بن برد، عربی زبان کے فارسی الاصل شعراء تھے، ابونواس کے بعض شعر کو دیکھکر فوراً ایک مبصر غیر عربی کہہ سکتا ہے، کیونکہ وہ گلنار، نرگس، گلاب، اور یاسمن کا تذکرہ کرتا ہے، جن کا عرب میں وجود بھی نہیں اور نہ عصر جاہلی کے عربی شعراء میں ایسے لطیف خیالات کا پتہ چلتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس کی ماں اہواز (فارس) کی رہنے والی تھی۔ (المجمل فی تاریخ الادب العربی" اور "الموازنہ بین الشعراء)

سیاسی نقطۂ نظر سے خلافت عباسیہ کے زوال کا صریح سامان تھا۔ چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ اُس نے آل علیؑ ابن ابیطالبؑ کے خلاف یہ اشعار کہے ہیں۔

بنی حسن وقل لبنی حسینٍ	علیکم بالسواء من الامور
امیطوا عنکموا کذب الامانی	واحلاماً یعدن عداۃ زور
تسمون النبی اباً ویأبی	من الاحزاب سطرٌ من سطور

خلاصہ مطلب یہ ہے،

بنی حسنؑ اور بنی حسینؑ ایک ایسی آرزو میں مبتلا ہیں جو حقیقت سے دُور ہے، وہ محض ایک خیال پریشاں میں سرگرداں ہیں وہ حضرت نبی آخرالزماں صلعم کو اپنا باپ بتاتے ہیں، حالانکہ خود نبیؐ کی طرف سے سورۂ احزاب کی ایک سطر میں اسکا انکار پایا جاتا ہے،

اسکی شرح میں ڈاکٹر زکی مبارک لکھتے ہیں۔

یرید قولہ تعالی فی سورۃ الاحزاب "ما کان محمد ابا احدٍ من رجالکم ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین" ویذکرون ان الرشید قال لہ ما عدت ما فی نفسی ثم امرہ ان یدخل بیت المال فیاخذ ما احب کما قال صاحب زھر الاداب مع ان للایۃ وجھا غیر ھذا الوجہ وتاویلاً غیر ھذا التاویل (الموازنہ بین الشعراء مطبوعہ مصر)

زکی نے سورۃ احزاب کی آیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ "محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں بلکہ خدا کے پیغمبر اور نبیوں کے خاتم ہیں"۔ بیان کیا جاتا ہے کہ رشید نے کہا کہ تم نے وہی کہا جو میرے دل میں ہے پھر اس نے اسے اجازت دی کہ بیت المال سے جتنا چاہے لے جیسا کہ زہر الاداب کے مصنف کا بیان ہے، باوجودیکہ آیت کی روح معنی اور تاویل کو زکی کی جدت طرازیوں سے تعلق نہیں۔ [۱]

---

[۱] اس قسم کی شاعر نوازی کا ایک واقعہ عادلشاہی خاندان کے ایک فرماں روا اسمٰعیل عادل شاہ کی زندگی میں بھی گزرا ہے، مولانا ملک قمی، نورالدین ظہوری کے گہرے دوست بھی تھے اور خسر بھی، گجرات سے آئے، اسمٰعیل عادل شاہ ان کی شاعری کا بڑا گرویدہ تھا کہا کہ خزانہ سے جتنا مال ایک مرتبہ لاسکیں لے لیں، قدرت جسے شاعری کا ذوق عطا کرتی ہے، اُسے ظرافت کی چاشنی بھی دیدیتی ہے مولانا نے فرمایا کہ سفر کی تکلیف اُٹھانے سے اسوقت کی بہ نسبت جب میں یہاں تھا آجکل نصف طاقت رہگئی ہے، اگر بادشاہ کی اجازت ہو، چند روز کے توقف کے بعد جب کامل قوت حاصل ہو جائے یہ کام عمل میں لاؤں بادشاہ نے کہا سہ کہ آفتاست در تاخیر و طالب را زیاں دارد اچھا الیسا ہی ہے تو "دو مرتبہ" جاکر لاؤ مولانا کے "نصف زور" گھٹ جانے کا یہی مقصد تھا بیت المال میں گئے اور دو مرتبہ میں پانچ ہزار ہون (تقریباً ڈیڑھ من) سونا لے آئے خازن گھبرا گیا اور بادشاہ کو خبر کی بادشاہ نے ازراہ خوشطبعی فرمایا "مولانا راست می گفت کہ من قوتے ندارم" سلاطین نے ہمیشہ علما و فضلا اور ماہرین فن کو نوازا ہے، لیکن علم و فن یا صنعت کمال کی قدرشناسی سے زیادہ انھیں اس سرپرستی میں، سیاسی اغراض کا حصول مطلوب رہا ہے۔

شعرائے مخضرمی اور اسلامی کے کلام میں اکثر ایسے قافیے اور ردیفیں ہیں جو قرآن مجید میں بھی ہیں بلکہ بعض اوقات آیت میں جو وزن پایا جاتا ہے، وہ بھی اُنکے کلام میں موجود ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ اُنھوں نے قرآن مجید کے محاسن انشا سے استفادہ کیا ہے عمرو بن معدیکرب (مخضرمی شاعر) نے اپنے بعض اشعار میں قرآن مجید کے سورہ مریم کے اسلوب بیان سے استفادہ کیا ہے، اسکے مشہور اشعار ہیں۔

لیس الجمال بمئزر ۔۔۔ فاعلم وان رُدّیت بردا

عمرو نے اس زمین میں سترہ اشعار کہے ہیں۔ جنہیں علی الترتیب یہ قوافی پائے جاتے ہیں۔

اورثن مجدا ۔ عداءً علندی ۔ تدًا ۔ نهدا ۔ قدا ۔ استعدا ۔ شدا ۔ تبدّی ۔ جدا ۔ بدّا ۔ اشدّا ۔ لحدا ۔ زندا ۔ جلدا ۔ عدا ۔ فردا ۔

اسی طرح قرآن مجید میں سورہ مریم کی آخری آئتیں پڑھیے۔ قل من کان فی الضلالة فلیمدد له الرحمن مدّا الی آخر فانما یسرناه بلسانك لتبشر به المتقین وتنذر به قوماً لدا۔ تقریباً بیس آیتیں ہیں، عمرو کے بعض اشعار میں قرآن کے قوافی بھی ملتے ہیں، یہی نہیں بلکہ قرآنی قافیہ لیکر معنوی حیثیت سے بھی عمرو نے استفادہ کیا ہے، چنانچہ کہتے ہیں:۔

اُغنی غناء الذاهبی ۔۔۔ اناالعدّ للاعداء عدّا

میں سلف کا کام انجام دیتا ہوں (اور اونکا قائم مقام ہوں) اور لوگوں نے مجھے دشمنوں ہی کے مقابلہ کے لئے رکھ چھوڑ رہے دیا یہ کہ دشمنوں کے مقابلہ کی گھڑیاں شمار کرتا رہتا ہوں کہ کب مقابلہ ہو اور میں اپنا جوہر دکھاؤں۔

قرآن مجید میں ہے۔ فلا تعجل علیهم انما نعد لهم عدا (سو آپ اونکے لئے جلدی نہ کیجئے، ہم انکی (باتیں) خود شمار کر رہے ہیں یا اُنکی حاضری کے لئے دن گن رہے ہیں) جو شخص کچھ بھی عربی کا ذوق رکھتا ہے، وہ سمجھ سکتا ہے کہ اُعدّ للاعداءً عدّا لکھکر عمرو نے قرآن مجید کے جملہ انما نعد لهم عدا سے کس حد تک فائدہ اوٹھایا ہے؟

عمرو بن معدی کرب :- ذهب الذین احبهم ۔۔۔ وبقیت مثل السیف فردا

میرے احباب چل بسے اور میں تلوار کی طرح یکہ وتنہا رہ گیا۔

قرآن مجید :- ونرثه ما یقول ویاتینا فردا (اور اوس کی کہی ہوئی چیز کے ہم مالک ہوجاوینگے وہ ہمارے پاس تنہا ہوکر آوے گا۔

ارباب بلاغت نے سرقہ غیر ظاہری کی ایک قسم یہ لکھی ہے کہ معنی کو الٹ کر یہ بیان کیا جائے، قرآن مجید میں اُن لوگوں کو ڈرایا گیا ہے، جو خدا کے متعلق طرح طرح کی باتیں گڑھتے رہتے ہیں اور ان کو یکہ وتنہا ہوکر آنے کی بیچارگی کا خیال دلایا گیا ہے، عمرو نے اسکو جذبہ لطیف کا جامہ پہنا دیا ہے، لیکن مرکزی خیال کے اعتبار سے دونوں عبارتوں میں مماثلت پائی جاتی ہے" بقیت فردا" اور" یاتینا فردا" کی یک رنگی سے کون انکار کر سکتا ہے۔

الغرض جستجو کیجائے، تو معلوم ہوگا کہ بہتیرے شعرائے مخضرمی اور اسلامی کے کلام میں قرآن کے ادبی اعجاز نے اثر کیا ہے، چنانچہ خود جارج سیل نے بھی مقدمہ قرآن میں اسکا اعتراف کیا ہے، وہ لکھتا ہے۔

قرآن مجید کے اسلوب بیان اور سجع عبارت سے عرب ایسا لطف محسوس کرتے ہیں کہ بعض شعرائے متاخرین نے اپنے کلام میں قرآن مجید کی عبارت اور بعض قرآنی اشارات و کنایات سے اپنے کلام کو مزین کرنا شروع کیا، اور اگر نا ممکن کے بعد کوئی دوسرا لفظ ہے تو کہہ سکتے ہیں کہ بغیر قرآن (مجید) پر تبحر رکھے ہوئے ان اشعار و کلام کو سمجھ نہیں سکتے۔

اسلامی ادبیات میں سجع کا رواج قرآن مجید پر غور و فکر کا نتیجہ ہے، چنانچہ عرب مصنفین کے حوالے سطور بالا میں دئے جا چکے، فارسی ادبیات و انشا میں بھی جو سجع عبارتیں ہیں، وہ مطالعہ قرآن ہی کا حاصل ہیں، سعدی نے گلستان، جامی نے بہارستان، اور نور الدین ظہوری نے "سہ نثر ظہوری" میں محاسن سجع کے جو غیر فانی نقوش چھوڑے ہیں وہ استفادہ قرآنی کی پیداوار ہیں۔

اب بحث یہ پیدا ہوتی ہے، کہ قرآن مجید میں سجع کا لحاظ کیوں رکھا گیا؟ میکڈانلڈ نے یہودی، یونانی اور قدیم عربی ادبیات سے جو نظریہ پیش کی ہیں اگر انھیں مان بھی لیں تو زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ دنیا کی مذہبی عبارت کے لئے سجع اختصاصی حیثیت رکھتا ہے، اور قرآن مجید کا الہام بھی اسی طریق انشا میں ہوا، لیکن اس سے کبھی انکار نہیں ہو سکتا کہ نزول قرآن کے وقت عربی شاعری اپنی منزل شباب سے گذر رہی تھی، اگر کوئی پیام روح اور درس اخلاق دیا جا سکتا تھا تو زمانہ ہی کے انداز ذوق اور رجحان طبیعت کے مطابق، اس سے تو میکڈانلڈ کو بھی انکار نہیں کہ کاہنوں کے بیان میں سجع عبارتیں تو ضرور رہا کرتی تھیں، لیکن ان میں کوئی اصلاح سیرت اور تزکیہ اخلاق کا سبق نہیں ہوتا، موصوف کا خیال ہے کہ کاہن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں یہی فرق ہے، جو بنی اسرائیل کے نزدیک "نبہیم" اور نبوت میں مابہ الامتیاز ہے، جب دنیا کے نطق الہامی کے لئے سجع عبارت مخصوص رہی ہے، تو پھر اعتراض ہی کیا ہے؟ جان ملکی کے اعتقادات کے متعلق اگلے سطور میں لکھا جا چکا ہے، اس کا خیال ہے کہ شاعر کا فرض ہے کہ وہ اپنا درس اخلاق اس انداز ذوق میں پیش کرے جو عوام میں متداول ہو، کیونکہ کوئی شاعر خدا کے لئے اپنا کلام نہیں پیش کرتا، بلکہ مخلوق کے لئے اس لئے اسے ماحول کے رجحان اور نفسی خصوصیات کو مد نظر رکھنا ضروری ہے بعثت اسلام کے وقت شعر و ادب کا چرچا تھا، سجع چونکہ شعر کی ایک قسم ہے سطور بالا میں یہ ثابت کیا جا چکا کہ نثر فنی میں قدیم عربوں کا کوئی ایسا کارنامہ ہی نہیں جس میں سجع کا وجود ہو اسلئے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید نے ایک خاص طرز انشا کی ابتدا کی، اس لئے قرآن مجید نے اپنے درس اخلاق اور تزکیہ انفاس کے لئے جو عبارت پیش کی، اسمیں طریق انشا کی وہی خصوصیت پیدا کر دی جس میں عام رجحان کو دعوت نشاط اور درس اخلاق دونوں ساتھ ساتھ ملتے رہیں، بلکہ عربوں کے اخلاق اور سیرت کی اصلاح کے لئے اس سے بڑھکر کوئی دوسری صورت ہی نہ تھی کہ سجع عبارت مخصوص کر لی جائے، تاکہ عام رجحان کو دعوت دینے میں سہولیت ہو اور انکی شاعرانہ التفات اسطرف مبذول کی جا سکے۔

چونکہ میکڈانلڈ نے قرآن مجید کے اعجاز ادبیہ کو آنحضرت کی طرف منسوب کیا ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ قرآن مجید اور احادیث کی ان تصریحات کے متعلق ایک سرسری نظر ڈال لی جائے جو شعر و ادب کے متعلق ہیں۔

سرسری مطالعہ کرنے کے بعد قرآن مجید میں پانچ جگہ شعر و شعرا کا تذکرہ پایا جاتا ہے۔

والشعراء یتبعھم الغاؤن ط الم تر انھم فی کل واد یھیمون ط و انھم یقولون مالا یفعلون ط الا الذین امنو و عملو الصلحت و ذکر اللہ کثیرا و انتصروا من بعد ما ظلموا ط و سیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون ط (شعراء)

وما علمنہ الشعر وما ینبغی لہ ان ھو الا ذکر و قران مبین (یٰس)

بالحق و صدق المرسلین (صفت)

ام یقولون شاعر نتربص بہ ریب المنون ط قل تربصوا فانی معکم من المتربصین (طور)

انہ لقول رسول کریم ط وما ھو بقول شاعر قلیلا ما تذکرون ولا بقول کاھن قلیلا ما تذکرون (حاقہ)

غور کرنے سے پتہ چلتا ہے، کہ متذکرہ بالا پانچ مقامات میں جہاں شعر و شعرا کا تذکرہ ہے، انمیں تیسرا اور چوتھا نمبر کفار کا مقولہ ہے، جسے اللہ تعالےٰ نے قرآن میں نازل فرمایا، بقیہ تین مقامات میں خود اللہ تعالےٰ کی رائے۔

اب سوال یہ ہے کہ اللہ نے ان تین مقامات میں شعر و شعرا کے متعلق کیا محاکمہ کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ سورہ شعرا میں شعر و شاعری کی مذمت کی گئی ہے، کہ وہ ادھر سے اُدھر بھٹکتے پھرتے ہیں جو کچھ کہتے ہیں وہ کرتے نہیں، کفار کو اسی جماعت سے مشابہ کیا گیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خدا کے نزدیک شعرا کا کیا درجہ ہے؟ لیکن ساتھ ہی یہ بھی اعتراض ہوتا ہے کہ "وانتصروا من بعد ظلموا" کو اس سے مستثنیٰ کیا گیا ہے، اس سے شعرا کی توصیف ظاہر ہوتی ہے، لیکن ذرا غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ توصیف ضمنی طور پر آگئی ہے، حقیقتاً شعرا کی توصیف مراد نہیں، دراصل مقصود یہ ہے کہ کفار اور شعرا کے عادات ضعیف میں مماثلت قائم کرکے جو شعرا کی برائیاں ہیں، انھیں کفار پر صادق لائی جائیں، اس لئے انکے یتبعھم الغاؤن فی کل واد یھیمون یقولون مالا تفعلون ط کے نقص و عیوب کا بیان کیا، لیکن چونکہ شعرائے اسلام کفار کے ہجو کا جواب دیا کرتے تھے، اور اسلام اور مبلغ اسلام کی حمایت کرتے تھے، اس آخری طبقہ "وانتصروا من بعد ظلموا" کو اگلے طبقہ سے علٰحدہ کرلیا، پس معلوم ہوا، کہ گو اتباع غوا، قول و فعل کا تضاد آخری طبقہ میں نہیں لیکن انکی توصیف مترشح نہیں ہوتی، لہذا نتیجہ نکلتا ہے کہ متذکرہ بالا آیات میں شعرا کو بہ کراہت و استحقارہ دیکھا گیا ہے، بہ نظر استحسان نہیں۔

دوسری جگہ اللہ تعالےٰ نے صاف صاف فرمادیا کہ اپنے پیغمبرؐ کو میں نے فن شاعری کی تعلیم نہیں کی اور نہ شاعری آپکے لئے کوئی مفید چیز ہے۔

تیسری جگہ شاعری اور علم کہانت کو ایک ہی طبقہ میں رکھا، اور فرمایا کہ میرا رسول جو کچھ کہتا ہے وہ شعرا کا

تخیل اور کاہنوں کی پیشین گوئی نہیں بلکہ جو کچھ اسے وحی کے ذریعہ سے پہونچتا ہے، اسی کی تبلیغ کرتا ہے۔

دو مقامات میں کفار کا مقولہ ہے، وہ نبی صلعم کو شاعر مجنون کہا کرتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ منصب نبوت کے لئے شاعری ایک عیب تھا اور اللہ تعالے نے بار بار اپنے پیغمبر کو اس الزام سے بچایا ہے۔

اب تحقیقات کا یہ مرحلہ باقی رہجاتا ہے، کہ حدیث نے اس کے متعلق کیا فیصلہ کیا ہے، اس سلسلہ میں مفصلہ ذیل عنوان پر غور کرنا ضروری ہے،

(۱) خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اشعار کہے یا پڑھے؟

(۲) آپ نے اشعار سُنے یا نہیں؟ کیا صحابہ میں شاعری کا شغف تھا؟

(۳) اشعار کے حسن و قبح کے متعلق آپ کا کیا فرمان ہے؟

پہلی شق کے متعلق تو قرآنی شہادت کافی ہے، "وما علمنہ الشعر" آپکی زندگی گویا قرآن مجید کی عملی تفسیر تھی عہد رسالت کی ۲۳ سالہ تاریخ بتاتی ہے کہ آپنے شاعری میں حصہ نہ لیا لیکن چونکہ آپکی طفولیت کا بڑا حصہ عرب کے فصیح قبیلہ میں بسر ہوا تھا، اس لئے آپ کی باتیں "جامع الکلم" کی صفت سے ضرور متصف تھیں، گو آپ نے شاعری نہ کی لیکن آپ کی زبان مبارک سے بعض اوقات ایسی باتیں نکلتیں جو شعر کی صورت اختیار کرلیتیں، غزوہ احزاب ہو رہا تھا، صحابہ کرام خندق کھودنے میں مشغول تھے، نبی باہر تشریف لائے، آپ نے صحابہؓ کے جدوجہد کا معاینہ کیا اور بے اختیار فرمایا۔

اللھم ان العیش، عیش الاخرہ　　فاغفر للانصار والمھاجرہ [1]

گو مرقومہ بالا الفاظ (دعائیہ) نے شعر کی صورت اختیار کرلی ہے، لیکن یہ بالکل اضطراری طور پر تھا، ارادی نہ تھا چنانچہ تاریخ فرشتہ میں شیخ ابوالحسن خسرو دہلوی کے تذکرہ میں لکھا ہوا ہے کہ جب اُنکے والد ماجد شیخ سیف الدین نے انتقال کیا تو وہ سات سال کے تھے، عہد طفلی کے اس زینہ میں خسرو شاعری کے اصول سے واقف نہ ہوں گے، لیکن فرطِ جذبات میں اُنھوں نے فی البدیہہ یہ شعر کہا۔

سیف از سرم گزشت و دل من دو نیم شد　　دریا کے ماروان شد و در یتیم ماند

معلوم ہوا کہ اعلٰے تربیت کے باعث کلام میں کبھی کبھی شاعری کی خصوصیت آجاتی ہے، اور یہ بالکل اضطراراً ہوا کرتا ہے، پس عہد رسالت کی تاریخ سے یہ بات ثابت ہوچکی کہ نبی صلعم شاعر نہ تھے لیکن آپ نے وقتاً فوقتاً اشعار پڑھے ہیں

---

[1] اے اللہ، عیش دراصل آخرت کا عیش ہے، انصار اور مہاجرین کو بخشدیجئے۔

امام بخاری نے اُنس بن مالکؓ کی روایت سے کتاب التفسیر (متعلقہ سورہ احزاب) میں پوری حدیث نقل کی ہے۔ اس میں لفظ "عیش" کے بدلے "خیر" ہے بقیہ الفاظ وہی ہیں جو "مغازی" کی مفصلہ بالا حدیث میں مذکور ہیں۔

چنانچہ امام بخاری نے حضرت براءؓ بن عازبؓ کی روایت سے ایک حدیث نقل کی ہے، جسمیں مذکور ہے۔

فسمعتہ یرتجز بکلمات ابن رواحۃ وھو ینقل من التراب — میں نے آپ کو مٹی ڈھوتے ہوئے ابن رواحہؓ کے اشعار پڑھتے سُنا۔

امام بخاری نے حدیث میں وہ اشعار بھی نقل کر دئے ہیں جو آپ نے جنگ خندق کے موقعہ پر مٹی ڈھوتے وقت پڑھے۔

اللھم لولا انت ما اھتدینا — ولا تصدقنا ولا صلینا
فانزلن سکینۃ علینا — وثبت الاقدام ان لاقینا
ان الالیٰ قد بغوا علینا — وان ارادوا فتنۃ ابینا

حضرت براءؓ بن عازبؓ فرماتے ہیں "ثم یمد صوتہ باٰخرھا" دوسری روایت میں مذکور ہے، ودفع بھا صوتہ ابینا ابینا، یعنی آپ جوش کے ساتھ بلند آوازی سے چھٹے مصرعہ کے آخری الفاظ پڑھتے، یعنی زور سے ابینا ابینا فرماتے۔

امام مسلمؒ نے اپنی حدیث میں "الشعر" کے نام سے ایک مستقل کتاب ہی لکھی ہے، جس میں دو تین ایسی روایات ہیں جن سے پتہ چلتا ہے، کہ نبیؐ نے حضرت عمروبن شریدؓ کے والد سے امیہ بن ابی الصلت کے اشعار پڑھنے کی فرمائش کی، چنانچہ اُنھوں نے شاعر مذکور کے اشعار پڑھے، پھر آپ نے فرمائش کی یہانتک کہ صحابی موصوف روایت کرتے ہیں، حتی انشدتہ مائۃ بیت۔

امام مسلم نے دوسری حدیث حضرت ابی ہریرہؓ کی روایت سے لکھی ہے، جسمیں مذکور ہے کہ نبیؐ نے فرمایا کہ عرب لوگوں کے جو کلام ہیں اُنمیں سب سے عمدہ لبید ابن ربیعہ کا یہ کلام ہے، الا ای کل شیءٍ ماخلا اللہ باطل"

اسی حدیث میں مشہور جاہلی شاعر امیہ ابن ابی الصلت کے متعلق آپکی رائے ہے" وکاد ابن ابی الصلت ان یسلم" ابن ابی الصلت اسلام کے قریب تھا۔

اب سوال یہ باقی رہجاتا ہے کہ آیا صحابہ میں شاعری کا شغف تھا یا نہیں؟ صحابہ کی زندگی کے واقعات بتاتے ہیں، کہ انمیں بڑے بڑے جلیل القدر حضرات شاعری کا مذاق رکھتے تھے، چنانچہ اس سلسلہ میں عبداللہ بن رواحہ، لبید ابن ربیعہ، حسان ابن ثابت، حضرت عامر وغیرہ کا نام لیا جاتا ہے، اور انکا کلام حدیثوں میں محدثین نے نقل کیا ہے، حضرت عبداللہ ابن رواحہ اور عامر کے اشعار بخاری (کتاب المغازی) میں ملتے ہیں، حضرت لبید ابن ربیعہ کے متعلق امام مسلم اور بخاری نے روایت کی ہے اصدق کلمۃ قالھا شاعرٌ کلمۃ لبید، حضرت حسان کے متعدد اشعار امام بخاری نے کتاب المغازی میں نقل کئے ہیں، جو اُنھوں نے بنی نضیر کی بربادی، حضرت عائشہ کی عصمت آبی اور نبیؐ کے ساتھ اپنے اظہار خلوص وعقیدت کے متعلق کہے ہیں۔[۱]

---

[۱] مینے اپنے عزیز دوست جناب مولوی عبداللہ صاحب "ادیب" مدرس ثانی مدرسہ وحیدیہ آرہ کے پاس ایک عربی دیوان دیکھا ہے، جسمیں صرف صحابہؓ اور صحابیاتؓ کے اشعار درج ہیں، اس سے واضح ہوتا ہے کہ عہد رسالت میں کثرت سے مسلمان (مرد اور عورتیں) شاعری کا شغف رکھتے تھے،

واقعات بالا سے پتہ چلتا ہے کہ صحابہ میں شاعری کا شغف تھا، اور وہ وقتاً فوقتاً اشعار پڑھا کرتے تھے، عہد رسالت کی تاریخ بتاتی ہے، کہ گو آپ نے اشعار موزوں نہیں کئے، لیکن آپ نے اشعار پڑھے، سُنے اور پڑھنے کی فرمائش کی، اب باقی رہا شاعری کے حسن و قبح کے متعلق آپ کا صحیح فرمان کیا تھا؟ امام مسلم نے حضرت ابی ہریرہؓ کی روایت سے ایک حدیث نقل کی ہے، جسمیں مذکور ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

لان یمتلئ جوف الرجل قیحا یریہ خیر من ان یمتلئ شعرا
اگر کسی کا پیٹ پیپ سے بھر جاوے تو یہ بہتر ہے اس سے کہ شعر سے بھرا رہے۔

بظاہر یہ حدیث شاعری اور حفظ اشعار کی مذمت کے متعلق معلوم ہوتی ہے، لیکن ذرا سا غور کیا جائے تو صاف معلوم ہو جاوے گا، کہ نبیؐ نے انہماک شاعری کے متعلق یہ خیال ظاہر فرمایا ہے، کیونکہ اشعار سے پیٹ بھرے رہنے کے یہ معنی ہیں، کہ قرآن و حدیث، اور دوسرے علوم و فنون سے دلچسپی باقی نہ رہے، انسان کے خیالات کا رجحان صرف شاعری کی طرف ہو، ایسی شاعری بیشک مذموم ہے، لیکن اگر دینیات اور دوسرے علوم کے ساتھ شاعری کا شغف ہو تو کچھ مضائقہ نہیں، اگر مطلق شاعری کے متعلق آپ کا یہ خیال ہوتا تو آپ عمرو بن شرید کے والد سے امیہ بن ابی الصلت کے اشعار پڑھنے کی فرمائش کیوں کرتے، اور سو بیت تک کیونکر سنتے رہتے؟

کیا قدیم شعرائے عرب کے مصرعے اور فقرے قرآن میں پائے جاتے ہیں؟

ڈاکٹر شٹڈل نے اپنی کتاب ”ماخذ قرآن“ میں اس حیثیت سے بھی نظر کی ہے کہ قرآن پر سرقہ لفظی کا الزام صحیح ہے، یا نہیں؟ وہ لکھتا ہے

”بعض اوقات محمدؐ کے متعلق کہا جاتا ہے، کہ اُنھوں نے صرف یہی نہیں کیا کہ عرب کے ایام جہالت کے بعض قدیم عادات اور مذہبی مراسم کو اسلام میں داخل کر لیا، بلکہ اُنھوں نے ایک قدیم عربی شاعر امرؤ القیس کے بعض اشعار سے سرقہ کیا ہے، لوگوں کا دعویٰ ہے کہ یہ آیتیں ہنوز قرآن مجید کے اندر موجود ہیں، معلقات کے ایک نسخہ کے آخر میں جو فارس میں مجھے ملا ہے، بعض ایسی غزلیں پائی جاتی ہیں، جنھیں لوگوں نے امرؤ القیس کی طرف منسوب کیا ہے، لیکن اُس کے کلام کے کسی دوسرے مجموعہ میں جو میری نظر سے گذرا ہے، میں نے یہ اشعار نہیں دیکھے، ان اجزا میں جن کے مصنف کی حالت بہت مشکوک ہے، میں مفصلہ ذیل اشعار پاتا ہوں، ہر چند ان اشعار میں بعض فاحش غلطیاں رہ گئی ہیں، لیکن میں اُنھیں بغیر تصحیح، انکی اصلی صورت میں پیش کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔

ذنت الساعة وانشق القمر　　عن غزال صاد قلبی ونفر
احور قد حرت فی اوصافہ　　ناعس الطرف بعینہ حور
مر یوم العید، فی زینتہ　　فرمانی فتعاطی فعقر

بسهام من لحاظ فاتك　　فترکنی کهشیم المحتظر

واذا ما غاب عنی ساعة　　کانت الساعة ادهی وامر

---

[1]

اقبل والعشاق من خلفه　　کانهم من حدب ینسلون

وجاء یوم العید فی زینه　　لمثل ذا فلیعمل العاملون

جن مصرعوں اور فقروں پر خطوط کھنچے ہوئے ہیں وہ قرآن مجید کے اندر بھی، سورۃ قمر، سورہ انبیا اور سورۂ صفت میں پائے جاتے ہیں، صرف بعض جگہ دو ایک الفاظ کا فرق ہے، لیکن معنی کے اعتبار سے دونوں ایک ہیں، اس لئے یہ ظاہر ہے کہ ان اشعار اور قرآن مجید کی آیات میں کوئی علاقہ ہے۔

امرؤالقیس کے ساتھ مفصلہ بالا اشعار کی نسبت کے متعلق شبہ کے کافی اسباب موجود ہیں، بہت ممکن ہے، قرآن مجید میں ایک شاعر کے کلام سے اقتباس درج ہونیکے بجائے خود قرآن ہی سے کسی شاعر نے استفادہ کیا ہو، ایک طرف یہ بھی خیال کرنا ایک وقت طلب امر ہے کہ استقرار اسلام کے بعد ایک آدمی قرآن مجید ہی کی عبارت کو شعروسخن کے اس (عشقیہ) اسلوب بیان میں داخل کرنیکی جرأت کر سکتا ہو، جس سے مرقومہ بالا اشعار کا تعلق ہے، دوسری طرف موجودہ زمانہ میں بھی مروج ہے، کہ کسی فلسفیانہ یا مذہبی رنگ کے کلام میں قرآن مجید کی آیتیں نقل کرتے ہیں۔ لیکن اس قسم کے کلام سے مندرجہ بالا اشعار کا تعلق نہیں (ڈاکٹر صاحب کو خبر نہیں، شاید اُنھوں نے فارسی شعرا کے دواوین کا مطالعہ نہیں کیا، ورنہ وہ اس اقتباس قرآنی کو فلسفیانہ اور مذہبی مضامین ہی تک محدود نہیں رکھتے، کیونکہ کثیر شعرائے فارس نے اپنے رنگ تغزل کو قرآنی آیتوں کے اقتباس سے رونق و تازگی دی ہے، جسپر آیندہ اوراق میں تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے)

یہ ایک وقت طلب مسئلہ ہے، کہ محمدؐ نے امرؤالقیس جیسے ایک مشہور شاعر کے کلام سے سرقہ کرنیکی جرأت کی گو اس حیثیت سے یہ قیاس ہو سکتا ہے، چونکہ معلقات سبعہ کے مروجہ مجموعہ میں یہ غزلیں عام طور پر مشہور نہیں تھیں۔

باوجود مشرقی، روایات کے قرینہ غالب ہے، کہ محمدؐ نے سرقہ اور تلقین سے کام نہیں لیا ہے[2]، جسکا ان پر الزام لگایا جاتا ہے، سرسی بے لائل کی یہی رائے ہے، جن سے بڑھ کر قدیم عربی شاعری کے رموز کا ماہر دستیاب نہیں ہو سکتا، ایک

---

[1] دراصل "اقبل العشاق" تھا کاتب کی غلطی کو ڈاکٹر صاحب نے سہنے دیا جیسا کہ خود لکھا ہے۔

[2] ڈاکٹر لٹڈل حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ "ریورنٹ ڈاکٹر زویمر ساکن بحرین مجھے آگاہ کرتے ہیں کہ میرے پاس ایک نسخہ ہے، جسکے اندر امرؤالقیس کے آخری کلام کے آخری سکشن میں "دنت الساعة وانشق القمر" موجود ہے، اسکے بعد وہ لکھتے ہیں کہ ایک شیخ جو جامع ازہر میں مدرس ہیں مجھسے کہتے تھے کہ یہ صریح اقتباس علمائے اسلام کو مشوش کر دیتا ہے۔

خط میں جو انھوں نے بطور عنایت مجھے لکھا ہے، ان اشعار کے مسئلہ تلفیق کے متعلق روشنی ڈالی ہے، اور بتایا ہے کہ یہ امرؤالقیس کا کلام نہیں اور اُسکے لئے جو دلائل پیش کئے ہیں وہ اسلوب بیان اور وزن و بحر سے متعلق ہیں، اسکے بعض افکار سے میں نے اس باب میں استفادہ کیا ہے۔

ڈاکٹر سٹڈل کے نظریات کی تنقید

ڈاکٹر صاحب نے امرؤالقیس کے جن اشعار کا تذکرہ کیا ہے، وہ دراصل امرؤالقیس کے اشعار ہی نہیں، معلقات سبعہ کی تدوین اور تالیف کے متعلق علماء کا اختلاف ہے، چنانچہ "ماخذ قرآن" کے حوالہ سے میں اس مسئلہ پر ایک سرسری روشنی ڈال چکا ہوں، معلقات سبعہ "المعلقات العشرہ" کا انتخاب معلوم ہوتا ہے، میرے پاس عربی ادب کی ایک مختصر تاریخ ہے، جسے مصر کی "وزارت معارف" نے ترتیب دی ہے (جنمیں طہ حسین، احمد امین، احمد ضیف، جیسے السنہ مغربی و مشرقی کے ماہر ادیب شامل ہیں) اسمیں کہیں معلقات سبعہ کا تذکرہ نہیں بلکہ "المعلقات العشرہ" کی تاریخ پر ایک مختصر بحث کی گئی ہے، جسکا ترجمہ حسب ذیل ہے،

عہد جہالت میں مختلف قبائل اور مختلف خطہ عرب میں کثرت سے مشہور شعراگذرے، لیکن قدیم عرب اور بعثت اسلام کے بعد بھی چار شاعروں کی فوقیت کے متعلق لوگوں کا اجماع تھا، جنھیں لوگ اُستاد کامل اور فن شاعری کا ماہر خیال کرتے تھے، انکے نام امرؤالقیس بن حُجر، زیاد بن معاویہ، معروف بہ نابغہ ذبیانی، زہیر بن ابی سلمی، قیس بن میمون معروف بہ اعشی ہیں، انمیں سے ایکدوسرے کی فضیلت اور کمال کے متعلق قدما کا اختلاف ہے، انمیں ہر ایک شاعر کے طرفدار اور حامی لوگ تھے، جنمیں بدوی، شہری اور اہل علم حضرات شامل ہیں، ان چار شاعروں کے بعد طبقہ ثانیہ کے شعرا ہیں، جنمیں مشہور ترین یہ ہیں، طرفہ بن عبد، لبید بن ربیعہ، عمرو بن کلثوم، التغلبی عنترہ بن شداد عبسی، حارث بن حلزہ لشکری اور عبید بن ابرص،

پہلی صدی ہجری کے بعد قدیم عربوں نے ان شعرائے عشرہ کے قصائد کا انتخاب کرکے ایک مجموعہ مرتب کیا اور اسکا نام مطولات رکھا، پھر اُسکا نام "معلقات" پڑگیا، لوگ ان دس قصائد سے خاص دلچسپی رکھتے تھے، اُنھیں جمع کرتے انکی شرحیں کرتے، اُنھیں جدا جدا لکھتے، اور حفظ کرتے۔[۱]

معلقات سبعہ میں "المطولات" کے تین شعرا نابغہ ذبیانی، اعشی، اور عبید بن ابرص کے قصائد نہیں ہیں۔

ورنہ "المجمل" میں جتنے قصائد کی تحلیل کیگئی ہے وہ وہی ہیں جو معلقات سبعہ میں بھی ہیں، لہذا نتیجہ نکلتا ہے کہ معلقات سبعہ

---

[۱] واختار القدماء بعد القرن الاول للهجرة عشر قصائد لهؤلاء الشعراء العشر سموها "المطولات" ثم سميت بعد ذالك بالمعلقات" والناس يعنون بهذه القصايد العشر عناية خاصة فيجمعونها ويفسرونها ويفردون لها الكتب و يحفظونها (المجمل فی تاريخ الادب العربی)

دراصل "المعلقات العشرہ" سے ماخوذ ہے، جب حقیقت یہ ہے، تو ڈاکٹر ٹسڈل کا تمام نقد و بصر، رد و قدح، اور شک شبہ ایک "سعی لاطائل" سے زیادہ نہیں"۔

ڈاکٹر صاحب عرب منافقوں کے خاص لہجہ میں فرماتے ہیں کہ "محمدؐ پر سرقہ کا غلط الزام لگایا جاتا ہے"، لیکن ڈاکٹر صاحب نے جس اسلوب سے اس مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے، اسے دیکھکر عہد نبوت کی وہ تاریخ سامنے آجاتی ہے، جب نبی کریم کے سامنے ظاہر داری کے طور پر منافقین آکر رسالت کا اقرار کرتے اور دراصل انکا اعتراف رسالت ایک انکار تھا، چنانچہ قرآن نے نفسیات کی اسی مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے،

اذا جاءك المنافقون قالوا نشهد انك لرسول الله والله يعلم انك لرسوله والله يشهد ان المنافقين لكاذبون

جب منافق آپ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسولؐ ہیں، اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ واقعۃً آپ اسکے رسولؐ ہیں لیکن (ساتھ ہی) اللہ اسکی شہادت بھی دیتا ہے کہ منافق جھوٹے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کو اس مسئلہ پر بحث کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی، جب تاریخ بتاتی ہے کہ معلقات کی تدوین ہجرت کی ایک صدی کے بعد ہوئی تو ظاہر ہے کہ عہد نبوت میں معلقات کا کوئی نسخہ ہی نہ تھا، تو انکے اس نظریہ کا کیا مفہوم باقی رہجاتا ہے کہ "معلقات کے مروجہ نسخوں میں یہ غزلیں نہیں اسلئے قیاس ہوسکتا ہے، کہ محمدؐ نے عرب کے قدیم شعرا کے کلام سے سرقہ کیا،

ڈاکٹر صاحب کی یہ بے سود خامہ فرسائی تو اس اعتبار سے ہے کہ معلقات کی تدوین اور تاریخ کے متعلق انھیں کافی معلومات بھی حاصل نہ تھیں اور اُنھوں نے اس مسئلہ کو معرض بحث میں لاکر تشنہ چھوڑ دیا اور لطف یہ کہ ڈاکٹر زویمر کی روایات لاکر انھوں نے ثابت کردیا کہ قصہ کے متعلق وہ کسی قطعی فیصلہ پر نہیں پہونچے، جس سے مقصود یہ ہے کہ عوام میں غلط فہمی پھیل جائے، سر سی سجے لایل نے جس ادبی نقطہ نظر سے بحث کرکے مسئلہ سرقہ پر تنقیدی روشنی ڈالی ہے، وہ قابل قدر ہے، معلقات میں تمامتر قصاید ہیں، سرقہ کی مثال میں جتنی غزلیں پیش کی گئی ہیں، انکے اوزان قصاید کے اوزان سے نہیں ملتے، اسکے علاوہ جارج سیل نے مقدمہ قرآن مجید میں لکھا ہے کہ عرب کے شعرائے متاخرین قرآن کی آیتیں اور فقرے اپنے کلام میں استعمال کرتے ظاہر ہے کہ ڈاکٹر ٹسڈل نے امرؤ القیس کے جن اشعار کا تذکرہ کرکے مسئلہ سرقہ پر روشنی ڈالی ہے، وہ امرؤ القیس کی بجائے عہد عباسیہ کے کسی غزل گو کا کلام ہے، جس نے قرآنی آیات اور فقروں سے استفادہ کیا ہے، جیسا کہ عبید اللہ بن قیس الرقیات، منصور نمری اور ابو تمام کے کلام سے پتہ چلتا ہے۔ (باقی)

عبد المالک آروی

براہ کرم خط وکتابت کے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیجئے۔　مینجر

خاقانیِ عہد قاآنیِ عصر علامہ آصفی نظامی

(بہ سلسلہ سابق)

آصفی کا تیسرا فخریہ ”دلبتانش“ اور ”حیرانش“ ہے، غالباً ان قوافی میں سب سے پہلے انوری نے قصیدہ لکھا تھا، خاقانی، عرفی، اور قاآنی وغیرہ تختِ خلافت پر متمکن ہوئے تو اُنھوں نے بھی اپنے پیش رو کا تتبع کیا۔ لیکن جہاں تک ہماری نظر ہے، خاقانی کا قصیدہ سب سے بہتر تسلیم کیا گیا ہے۔ اس نے تشبیب میں سب سے پہلے متصوفانہ نغمہ استعمال کیا۔ اور آئندہ کے لئے نئی راہ پیدا کردی۔ متاخرین میں صرف عرفی سے امید تھی۔ کہ اس روش کو اختیار کرے گا لیکن ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ جب اس کا قصیدہ باین الفاظ ہماری نظر سے گذرتا ہے کہ

دلِ من باغبانِ عشق و حیرانی گلستانش!

ازل دروازۂ باغ و ابد حسد خیابانش!

عرفی نے قصیدہ کیا لکھا ہے۔ اس کے متعلق کچھ کہنا بیکار ہے۔ تم خود خاقانی اور عرفی کے قصیدے کو پہلو بہ پہلو رکھکر دیکھ لو۔ کہاں تصوف کے نازک ترین معاملات، اور کہاں گل، گلستان، باغبان، اور باغ وغیرہ کا بیجا صرف۔ خیر اس میں بھی کچھ مضائقہ نہ تھا۔ اکثر شعرا نے اس پردہ میں لیلئ جمال کو جلوہ گر دیکھا ہے۔

مگر افسوس ہے کہ یہاں عرفی اپنی مسلکِ شعر کو خیرباد کہہ چکا ہے۔ اگر اس کے کلیات کے تمام نسخوں میں یہ قصیدہ مندرج نہ ہوتا تو شاید ہی یقین آتا کہ یہ الحاقی نہیں ہے۔

اس کے برخلاف آصفی نے اس دریا کو مشاق ترین تیراک کی طرح عبور کیا۔ اُنھوں نے ٹھیک اُسی جگہ قدم رکھا جہاں سے خاقانی نے قدم اُٹھایا تھا۔ مگر اسی طرح نہیں۔ زیادہ سنبھل کر، اور زیادہ تیزی سے فرماتے ہیں۔

دلم طفلے، دبستانش عشق، و خاموشی دلبستانش
معلم فیضِ ہستی، نقشِ امکاں حرفِ لنیانش

سرِ زانو بجنبشہاش بود اندم تختۂ مشقے،
کہ عقلِ اولیں گردد سبق آموزِ امکانش

بجز فیضِ معلم، در نگاہِ حیرت ایجادش
نمی گردد سیاہی، از کمین چشمِ حیرانش

سوادِ ہوش روشن کرد چوں از فطرتِ عالی
نمودِ خود بحالِ خویشتن میداشت گریانش

معلم دید استعدادِ فطرت از فنا ایمن!
سرشکِ خوں بدامن پاک فرمودہ ز مژگانش

بہ پیشِ چشم او آئینہ بنہاد از رازے!
کہ عکسش بے نیازی داشت از اعیانِ امکانش

تجلی برق زو بر دیدۂ ادراک او آمد! — کہ عکس و آئینہ شد محو و ماندہ چشم حیرانش

پس از حیرت نگاہی یافت چوں سرمایۂ بینش! — تجلی کرد دیگر جلوہ در آغوشِ مژگانش

بآں پرتو بچشمِ او فروغِ آگہی آمد — کہ خواہد در کنارش چرخ و صد خورشید تابانش

شیونات تحشر در محیطِ نقطۂ دیدہ! — کہ از پرکار وحدت بود ہم عنوان و پایانش

نہ نقطہ، بلکہ از میمِ محمدؐ چشمۂ بودہ — کہ از ہر قطرہ اش سر بر زدے صد چرخ و کیوانش

ان اشعار کو پڑھو۔ اور دیکھو صوفیانہ نقطۂ نظر سے، انسان اور عالم کی حقیقت کا اظہار کس پختگی سے کیا گیا ہے خاقانی نے بھی یہی نغمہ الاپا ہے۔ لیکن الحق کہ اس درجہ مغز نہیں۔ مولانا آگے چلکر فرماتے ہیں۔

ز طفلے گوش کن اسرارِ ہستی گر نو آموزی — معلم بود فیضِ لایزالی در دبستانش

ز لوحِ عشق درس خامشی زاں پیش بگرفتم — کہ عقل اولیں از کاف نوں گردد سبق خوانش،

در آں مکتب کہ باشد حیرت انشا خامۂ فطرت — نہ باشد غیر مشق خامشی در لوحِ عنوانش

ز دردِ عشق خاموشی بہ است از نالہ انگیزی — کہ می نالد طبیبِ عقل از اندوہ درمانش

مخلص

سلسلۂ کلام میں نامعلوم طور پر، کسی کی تعریف یا مذمت شروع کر دینا، مخلص یا گریز کہلاتا ہے۔ بہتر مخلص وہ مانا جاتا ہے۔ جہاں اس خوبی سے مدعا بیان کیا جائے، کہ سننے والا اُسے ماقبل کا نتیجہ خیال کرے۔ ذہن سرعت سے اسطرف منتقل ہو سکے، اور طبیعت میں استعجاب نہ پیدا ہو۔

شعرا نے عموماً مخلص میں زور لگایا ہے۔ آصفی نے بھی بڑے حسن سے اس فرض کو انجام دیا ہے۔ چند مثالوں سے اس کا اندازہ ہو سکے گا۔

(۱) نعتیہ قصیدہ لکھ رہے ہیں۔ تشبیب میں علو ہمت کی تعلیم، خودداری اور منت ناپذیری کی تلقین، اور گداگری کی مذمت کرتے کرتے فرماتے ہیں۔

گر حرص کشد دامنِ قناعت بلبو الے — سلطانِ عرب دایہ دہد دخل عجم را

آں شاہ جہاں گر و جہاں بخشش کہ جودش — طغرائے کمال ست مناشیر کرم را

(۲) بہار کی لطافت سے صفحے رو کشِ گلزار ہیں، نشو و نما کی فراوانی سے عالم خطۂ کشمیر نظر آ رہا ہے۔ گلہائے تر کے جوشِ رنگ و بو سے دشت و صحرا کو گلبن و بوستاں کی ہمسری کا دعوے ہے، یاسمین و نسترن اور سنبل و نرگس سے دنیا بھری ہے، رندان مے آشام رنگ رلیاں منا رہے ہیں، دنیا میں عیش و نشاط کی محفلیں آراستہ ہیں، ہمجولی کھیل کود میں مشغول ہیں۔ احباب باہم مبارکباد دے رہے ہیں، مصاحب رؤسا و سلاطین کے حضور میں تہنیت نامے پیش کر رہے ہیں گو شاعر گوشۂ عزلت میں بیٹھا ہوا یہ سب کچھ سن اور دیکھ رہا ہے، مگر اُسے کچھ ایسی لو لگی ہے کہ صرف ایک ہی آستانہ کا

پرستار اور ایک ہی ذات کا والہ بنا ہوا ہے۔ چنانچہ بلبلوں کے نغمے سُن کر ضبط نہیں کر سکتا۔ اور آسمانی ترانہ شروع کر دیتا ہے۔
یہ مضمون آصفی کے ہاں یوں ادا ہوا ہے۔ بہار کا تذکرہ کرتے کرتے فرماتے ہیں۔

دریں بہار، کہ ہر کس کشادہ بر رخِ دل		در نشاطِ پرستی و عیشِ ایواں را
عجب کہ سجدہ زمستی بپائے خم نکنند		کہ گشت میکدہ بیت الحرامِ مستاں را

ہنداساس بہ وضعِ ہنروری کمال		ندیم، رسم ستائش گری سلطاں را
باتہزازِ طرب از درونہ جوش زند		بلب ترانۂ گل، بلبلِ خوش الحاں را

بگرمیٔ نفس افروختم بہ کلبۂ تار		زلعتِ نورِ خدا، شمعِ دین و ایماں را
ظہورِ ہستیٔ حق، عینِ قدرتِ اعجاز		کہ کرد پارہ لبِ بابہ، ناہ تاباں را

(۳) صنم پرستی میں عمر کا گراں مایہ حصہ صرف ہو چکا ہے، نیاز عشق پتھر کے مغرور و بیجان مجسمہ کے روبرو نیم بسمل ہے۔ مگر بے سود۔ یکایک معاملہ ضبط کی حدود سے گذر جاتا ہے، اور طبیعت دیر کی جگہ حرم اور صنم کی جگہ خدا کی جویا ہوتی ہے۔ مگر راستہ دشوار گذار اور منزل کٹھن ہے۔ ادھر سامنے راہ ناپید ہے۔ نگاہ اٹھتی سہی، ورنہ ناپید کنار وشت میں گم ہو کر رہجاتی ہے۔
عقل سرگرداں ہے۔ کہ راہ پر کہاں سے لائے۔ یکایک ممدوح کا خیال آجاتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

ہر چند کہ ایں مرحلہ از صعب گزاری		فرسودہ کنند حوصلۂ اہل ہمم را
اما عجبے نیست، کنند آصفِ دوراں		خضر رہ من، قائد، توفیق کرم را

(۴) برسات کا موسم ہے۔ تمازتِ آفتاب نے بخارات کے انبار لگا دئے ہیں۔ ہوائیں چلتی ہیں اور ان فی ذول کو فلک تاز بنا دیتی ہیں۔ ذرات بادل بادل کی کالی گھٹائیں بنکر عالم پر چھا جاتی ہیں، بادل گرجتا ہے، بجلی چمکتی ہے اور دنیا مارے ڈر کے سہمی جاتی ہے۔ شاعر دیکھ کر حیران ہے۔ اللہ۔ اللہ کسقدر ڈراؤنی گھٹا ہے۔ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا۔ سچ ہے،

جہاں در ظلمتش خفتے، ہمہ انوار بنہفتے
بنودے عدلِ سلطانِ دکن، گر مطلع بیضا

(۵) بہار کا موسم ہے۔ اور دنیا رشکِ فردوس نظر آرہی ہے۔ مگر شاعر اپنے تنگ و تاریک گھر ہی میں بیٹھا ہوا ہے۔ دل چاہتا ہے کہ مناظر قدرت کا تماشا کرے۔ مگر یہ ہے کہ پڑا گھٹ رہا ہے۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر دل سے نہیں رہا جاتا۔ اور مجبور ہو کر کہہ اٹھتا ہے۔

عالمے از بادۂ عشرت دماغے تازہ کرد — مغز جانم از خمارِ غم پریشاں آمدہ است
تو دریں خلوت نشستی، عرصہ بر من تنگ شد — وقتِ چاکِ جیب و داماں و گریباں آمدہ است
تا یکے در کنجِ تنہائی، بخلوت خوں شدن — غنچہ آسا تا بلب خونابِ شریاں آمدہ است

شاعر سُنکر جواب دیتا ہے۔

خرمش باشد جنوں بے یار و ساقی سیرِ باغ — گرچہ در گلزار، سازِ باغِ رضواں آمدہ است
تا نہ باشد ساغر و مینا بہ پیشش می گسار — لالہ و گل ہمچو خونابِ شہیداں آمدہ است

دل ہوا و ہوس کا مطیع بندہ ہوتا۔ تو اسے منظور کر لیتا۔ لیکن وہ "عرشِ الٰہی" ہے۔ لہذا اس پر برہم کو سنجیدہ فہمائش شروع کرتا ہے۔

گفت بود خمرِ ہوائے نفس، ساقی و شراب — عقل زیں سازِ ہوس، بر خویش لرزاں آمدہ است
دل بہ مہرِ سادگاں بستن، ز فسق ست و فجور — صحبتِ ام الخبائث، کارِ شیطاں آمدہ است
از حضورِ نفس بگذر، ہمدمِ عقل کن — آں چو زنداں ست ایں چوں باغِ رضواں آمدہ است

شاعر اس کا جواب وہی دیتا ہے۔ جو ہر امرد پرست صوفی دیا کرتا ہے۔ یعنی "ہم ان خاکی نقوش میں صنعِ باری کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ قضائی شہوت مقصود نہیں ہے۔ کیونکہ

ہر چہ خوباں را بود خوبی حسن از خط و خال — حسنِ صانع، در نقابِ خطِ خوباں آمدہ است

دل یہ جواب سُن کر ہنس پڑتا ہے۔ یا اللہ۔ کسقدر مکار لوگ ہیں۔ خواہ مخواہ مغالطے میں ڈالتے ہیں۔ کیا فطرت کا مظہر صرف یہی ہے۔ کیا قدرت کی گلکاریاں اسقدر محدود تھیں، کہ اُن سے صرف انسان ہی بہرہ مند ہو سکا۔ سبحانک ہٰذا بہتان عظیم" فطرت کی توہین کرنیوالے۔

عالم نیرنگ وارد، ہر گلے اندر کنار — عالم امثال از گلشن نمایاں آمدہ است

کیوں کہ

ہر گلے آئینہ دارِ لالہ رویاں آمدہ است

جلوۂ ہر نقش می بیند بہ چشمِ دل مبیند — بستنِ دل بر صور، از نقصِ انساں آمدہ است
گر نہ داری آگہی، اوضاعِ عالم را نگر — کو حدوثِ ذات، نقصانش بامکاں آمدہ است

شاعر کی عقل سے غفلت کے پردے اُٹھ جاتے ہیں۔ لیکن ایسی رہنما ذات کہاں تلاش کرے، جو اسرارِ عالم سے کما حقہ واقف ہو۔ اس پر دل رہنمائی کرتا ہے۔ اور رسول خدا کی طرف اشارہ کر دیتا ہے۔

گفت برگیر از کمالِ ذاتِ پیغمبر سبق — آنکہ ذاتش مظہرِ اسرارِ اکواں آمدہ است

آنکہ خاشاکِ حریمش، باغِ رضواں آمدہ است گلبنِ باغِ نبوت، گلشن آرائے شرف

(۶) بہار دنیا پر چھائی ہوئی ہے۔ درخت، شاخ، پھول، پھل، پتے، کونپلیں، گھاس، غرض ہر وہ شے جس میں نمو کام کر سکتا ہے، سرمست ہے۔ یوں تو ہر زمانہ میں شراب خوشگوار ہوتی ہے۔ لیکن خاصکر ایسے زندہ وقت میں تو یہ صرف مزہ ہی نہیں، ہمہ زندگی ہے۔ اس عیش نوید ہنگام سے زمانہ حظ اُٹھا رہا ہے۔ لیکن شاعر اب بھی غم نصیب ہے۔ کیونکہ

چرخ بمن داشت جنگ، غصہ ظلم تنگ داشت
پیکرِ بیرنگ داشت، بخت ستیزہ شعار

یکایک دروازہ پر کوئی دستک دیتا ہے۔ شاعر دیوانہ وار دوڑتا ہے۔ دروازہ کھولتے ہی، آنکھوں کے سامنے بجلی سی کوند جاتی ہے۔ سامنے وہ ذات نظر آتی ہے، جو مختصراً الفاظ میں اسکی روح ہے، لیکن یہ کس لئے، کیا آج اسکی امیدیں بر آئیں گی۔ ہاں، بیشک۔ کیونکہ آج اُس نے آتے ہی

لب بہ لبِ من نہاد، جاں بہ تنِ مردہ داد
غنچۂ دل بر کشاد، ہمچو نسیمِ بہار

جب شاعر کی رگوں میں زندگی دوڑ جاتی ہے، تو وہ ہر طرح دادِ عیش دینے کو تیار ہو جاتا ہے۔ معشوق ساقی بنتا ہے۔ اور ایسی مجلس میں شراب ہی شراب ہے! جب ذرا دماغ بادۂ عیش سے تازہ ہو جاتا ہے تو معشوق خسرو دکن کی مدحت شروع کرتا ہے کہ وہ ایسا بہادر، کرم گستر، سخی اور مسیحا ہے کہ زمانہ میں نظیر نہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ اس میں تو مطلق شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ لیکن یہ بھی تو واقعہ ہے کہ اس ذات تک رسائی کہاں۔ اہلِ جاہ وہاں رسا ہیں وہی فیض یاب بھی ہوں گے۔ معشوق۔

گفت ندانی مگر، نیست ترا زاں خبر — بادشہ دادگر، از خردِ خوردہ کار
از ہمہ دانشوراں، وز ہمہ نام آوراں — زعمِ دگر برتراں، کرد گزیں مردِ کار
صدرِ امیراں گزید، بدرِ مشیراں گزید — فخرِ دبیراں گزید، شاہ عدالت شعار
حضرت عبدالرحیم، کز خرد مستقیم — معتقدست وکریم، ہمہ صفا ردکیار

(۷) معشوق نے آکر شاعر کو بیتابِ شوق کر دیا۔ آہ۔ کوئی کس طرح قابو میں رہ سکتا ہے۔ جبکہ

صورتِ عقدِ ثریا، کہ بود در شفقے — بود در حقۂ یاقوتِ لبش سلکِ گہر
بود از پرتوِ رخسارۂ او شب کافور — بود کافور ہم از سایۂ شب چون عنبر
از حریرِ تنِ صافی گہرش می لغزید — گر رسیدے بہ تنِ او ز ہوس دستِ نظر

ذوق از لعل لبش در شکرستاں آمد — لذتش برد ز دل لذتِ قند و شکر
سنبلِ غالیہ گونش بدماغم افگند — شورِ سودائے جنونے بہوائے دیگر

جسطرح تشنہ سراب کو دیکھ کر دیوانہ دوڑ پڑتا ہے، ٹھیک اُسی اضطراب و شوق کے ساتھ شاعر اُسے آغوش میں لے لیتا ہے۔ ناز و غمزہ کے بعد معشوق کہتا ہے" یہ تو نے اپنا حال کیا بنا لیا ہے۔ نہ سیرِ باغ ہے۔ نہ بادہ و ساغر ہے۔ دنیا میں مجلسِ عیش آراستہ ہے۔ تجھے دیکھو تو سیہ خانہ میں پڑا ہوا ہے۔ نہ معشوقِ شیریں کام در پر ہے۔ نہ انیس و جلیس میسر" شاعر جواب دیتا ہے" یہاں ساغرِ شراب، اور شاہدِ روح پرور کا کیا ذکر۔ یہاں تو صدائے "اللہ اکبر" کانوں میں آجاتی ہے۔ اور بس۔ ہر طرف رندی و ہوسناکی کے عوض، زہد و اتقا کا دور دورہ ہے" وہ پوچھتا ہے" یہ کون مقام ہے" ہم نے تو ایسی جگہ نہ دیکھی نہ سنی۔ یہاں کا فرماں روا کون ہے۔ اور وزارت کی باگ کس کے ہاتھ میں ہے" شاعر جواب دیتا ہے

گفتم ایں شہر نہ باشد کہ بہشتِ امن ست — مطمئن ہست دلِ خلق ز ہر گونہ حذر
میر محبوب علی خانِ نظام آصف جاہ — کہ بود فخر سلاطین و خدیو کشور
آسماں جاہ ارسطوئے زماں دستور لیست — کہ پئے عز و جلال ست وجودش مفخر

(۴) سورج اپنی خواب گاہ میں استراحت کو جا چکا ہے۔ نیلے آسمان پر، روشن فرشتے جلوہ آرا ہیں، چاند سبعہ سیاروں کو ہمراہ لیکر، مجلس میں آ بیٹھا ہے۔ شمعیں روشن ہیں، حسین رقاصہ کھڑی ہے، اور ارباب نشاط سامعہ نوازی کر رہے ہیں، شاعر اپنے تاریک صحن میں لیٹا ہوا، رشک آمیز نگاہوں سے یہ ماجرا دیکھ رہا ہے۔ کاش اسکا دل بھی پہلو میں ہوتا کہ اتنے میں

ماہِ دو ہفتہ من، کونت در پستہ من — داد آواز ز مستی بنوائے دف و چنگ
بہ کفے بسا غرمے، در کفِ دیگر میداشت — بطِ مے راچو عقابے، کہ بگردد رِ جنگ
گفتم اے نازِ تو سابق قدم از فتنۂ حشر — دی بتاراجِ نگاہِ تو ہمہ چین و فرنگ
طرۂ لیلیٔ شب، مشکِ سیہ افشاند — تو دریں پردۂ نیرنگ چہ دارائی آہنگ
پردۂ کحلیٔ شب، مشکِ فروش خوابست — خفت در مشک بایں لحظہ چہ دم ست چہ زنگ
سر بیالش بنہ و نرگسِ فتاں بر بند — محتسب تا نخندر عربدہا با سرِ جنگ
گفت امشب بہ یکے بادہ ہست اندر خراب — عس و محتسب و شحنہ بود یا سرِ ہنگ
گفتم اندازۂ گفتار نگہدار بہوش — تو چہ پنداری بہ مستی، کہ جہان ست پلنگ
گفت ہشیاری چو تو بدرِ غفلت نزد — حالِ کشور چہ شناسی تو دریں گوشۂ تنگ
امشب از وسعتِ مشرب بدکن داد صلا — جشنِ سالِ شہِ زینت دہِ تاج داد رنگ

(۹) نواب سر زمل اللہ خاں بہادر رئیس بھیکم پور کی مدح میں میمیہ قصیدہ لکھا ہے۔ یہاں جس بے ساختگی کے ساتھ گریز کی ہے اُس کی مثالیں بہت ہی کم نظر آتی ہیں۔ فرماتے ہیں۔

چوں ہلالِ رمضاں شد شرف افزائے صیام　　تافت از وے بفلک اخترِ عزِ اسلام
سبجلِ روزہ بر آراست چناں مفتیٔ روز　　کہ بہ آفاق حلالش ہمہ گردید حرام
گر مسیحا ز فلک مائدہ می آورد　　بودے از نعمتِ جنت متنفر لب و کام
فی المثل خضر اگر آبِ حیات آوردے　　حرمتش بود لصائم صفتِ آبِ حرام

بانگِ تہلیل بہم گشت ز ہر سینہ بلند　　شورِ تسبیح ز دل بست بلبہا احرام
جائے گلبانگِ صراحی، نفس توبہ پرست　　جائے مے بود سرشکِ شفقی اندر جام

نارسا گشت چناں سلسلۂ زلفِ دراز　　کز کشاکش دلِ شوریدہ پذیرفت آرام
از دکن روئے نہادم لبوئے کشورِ ہند　　پائے جولاں بکشادم بہ سفر از آرام
دلِ آشفتہ نمی یافت تسلی کدہ　　طبعِ شوریدہ نمی کرد بہ یک جائے مقام
چار میں ہفتہ شد آخر چو ازاں ماہِ صیام　　ماہِ دو ہفتۂ من آمدہ چوں ماہِ تمام
جنبشِ ابروئے او برقِ قیامت آثار　　مستیٔ نرگسِ او فتنۂ محشر انجام
گردشِ چشمِ سیہ، فتنۂ دورِ گردوں　　حلقۂ زلفِ رسا، سلسلۂ روز قیام
ور او نگاہِ نیاز کشش زخمِ ابروئے　　پشت دستے بزمیں داشت مہِ نو بسلام
شوخِ مستانہ، لبِ راز نہادہ بلبم　　بوئے صہبائے لبش برد ز سر ہوش انجام
گفت تلخ رمضان ست بغربت مپسند　　کہ کنم صبر زمے تا سحرِ عیدِ صیام
ساز و برگِ طرب آرائے کہ بن از ماہے　　بادۂ ثانیٔ عشرت رمضان کرد حرام
گفتم اے شوخ بغربت چہ طرب می جوئی　　ساقی و بادہ کجاست و کجا شیشہ و جام

نہ حریفے کہ لبا زیم با و سازِ طرب　　نہ جلیسے کہ طرازیم با و بزمِ مدام
چوں من و تو ز سفر سوئے وطن باز رسیم　　بگزینم بہم ہمدمی شیشہ و جام

اس پر معشوق بر افروختہ ہو گیا۔ ریائی زہد کے طعنے دئے۔ اور ترکِ ملاقات کی دھمکیاں دیں۔ اور

شکست توبہ پر آمادہ کیا۔

گفتم از مستیٔ چشم تو جہاں مست مدام — گفتم اے بادۂ لعل تو خمار امکاں

کہ پشیماں شوی از رنج خمار انجام — اندریں کشور بیگانہ مشو عیش پرست

جرگہ بندند بگرد من و تو زیں آشام — عسس و محتسب و قاضیٔ کشور بر سند

اس کے بعد کیا ہوگا۔ یہ ہے وہ نقطۂ جہاں سے بیک جولانیٔ فکر، آصفی ممدوح کیطرف متوجہ ہو جاتے ہیں یعنی

پیش فرزانۂ دیں پرور عز اسلام — ماجرائے من و تو فاش دم صبح کنند

مذکورہ مثالیں صحیح اندازہ کرنے کے لئے بہت کافی ہیں۔ مزید شوق کے لئے کلیات میں کافی سامان سکون ہے۔

خاتمہ

خاتمہ اصطلاحِ شاعری میں، قصیدہ کے وہ آخری اشعار کہلاتے ہیں، جن میں ممدوح کی درازیٔ عمر وجاہ وغیرہ کے لئے دعائیہ کلمات استعمال کئے جاتے ہیں۔ عربی قصائد میں ابتداءً اس کا التزام نہ تھا۔ یا تو مدح پر قصیدہ کو ختم ہی کر دیتے، یا کچھ تھوڑی بہت استدعا بھی کر لیتے تھے۔ غالباً خاتمہ کی زیر بحث شکل اس وقت معرض وجود میں آئی ہے۔ جب عرب کے قصائد فارسی رنگ روپ اختیار کر چکے تھے۔ بہرحال فارسی میں خاتمہ قصیدہ کا لازمی جز رہا ہے

خاتمہ میں شعرا نے سب سے زیادہ غلو کیا ہے۔ جس قصیدہ کو اٹھا کر دیکھو۔ زمین و آسمان کے قلابے ملائے ہیں۔ سب سے کمزور غلو غالب نے اپنے ایک قطعہ میں استعمال کیا ہے۔ کہتا ہے۔

تم سلامت رہو ہزار برس

ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

قصیدہ، مدحیہ نظم کا نام ہے۔ مدح کسی مطلب سے یکجاتی ہے۔ اس لئے چناں و چنیں کے بعد حرفِ مطلب زبان پر آنا لازمی ہے۔ مداح فرض کرتا ہے۔ کہ ممدوح ستائش پر خوش ہو کر صلا دیگا۔ اسلئے اُسکو زائد خوش کرنے کیلئے، مدعا طلبی کے بعد، اس کے لئے دعا کرتا ہے۔

بہت ممکن ہے کہ سب سے پہلے جس نے دعا دی ہو۔ وہ پر خلوص ہو۔ لیکن کاغذ نے جن قصیدوں کو محفوظ رکھا ہے انمیں بلا استثنا کوئی ایک بھی سچی اور صحیح دعا پر حاوی نہیں۔ جب اوصاف میں، اسقدر ملمع برتا گیا ہے، تو دعا کسطرح سادی رہ سکتی تھی۔ سب سے زائد جس شئے سے انسان کو محبت ہے، وہ عمر ہے۔ انسان کسی حالت میں ہو۔ سچے دل سے موت کی تمنا کبھی نہیں کرتا۔ دولت کے ساتھ ساتھ یہ حالت زیادہ ترقی کر جاتی ہے۔ جو جسقدر زیادہ دولت مند ہوتا ہے۔ اسیقدر زندگی پر زیادہ حریص بھی ہوتا ہے۔ چونکہ اس کے دامنِ آز میں، عمرِ خضر و الیاس کے بھی چند لمحے ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ طالبِ عمر

کی دعا سے خوش ہوتا ہے۔ شاعر جو کچھ لینا چاہتا ہے۔ چند لفظ خرچ کر کے، اسکی آرزو کو تسکین دیدیتا ہے۔ اور کچھ لے بھاگتا ہے، رہ گئی قبولیت، تو نہ اسے قبولیت سے کچھ فائدہ، اور نہ عدم قبولیت پر کوئی نقصان۔

خیر، مقصد یہ ہے، کہ آصفی نے بھی اپنے خاتموں میں سراسر تقلید برتی ہے جس راہ پر شعراء سلف چلتے رہے تھے، وہی اختیار کرلی۔ بہت ممکن تھا، کہ وہ اجتہادی قدم اُٹھاتے، لیکن یہ یقینی ہے، کہ دقتی فضا میں اُن کے لئے آزادی کا سانس لینا محال تھا۔ وہ اسوقت پیدا ہوئے تھے، جب بزمِ مدح کا خمار حد سے گذر چکا تھا طبیعتیں فرضیات کی عادی ہو گئی تھیں۔ اس لئے خمار شکنی کے لئے بھی اُسی شراب کی ضرورت تھی، مجبوراً اُنھیں وہی پیش کرنا پڑی۔ البتہ بعض مقامات پر یہ کوشش ضرور کی، کہ واقعاتی دنیا، فرض وادعا کو اپنے ہمراہ لیلے۔ مگر یہ پہاڑ کے مقابلہ میں رائی کا دانہ تھا۔

شاعر کے فرض وادعا کو سب سے زائد پناہ نعت میں ملتی ہے۔ نعت میں ممدوح وہ ذات ہوتی ہے۔ جو اعتقاداتی دنیا میں خدا کے بعد سب سے بزرگ و برتر ہے۔ اس لئے اس کے اوصاف میں بھی، زبان وقلم سے وہ تمام اسماءِ صفت نکل جاتے ہیں، جو حقیقت پر محمول کئے جائیں، تو بلا اشتنا انسان کی ہستی سے بالاتر نکلیں، مگر اس کے باوجود قائل کی عقیدت "ہل من مزید" پکارتی ہے۔ وہ جسقدر مبالغہ کرتا ہے۔ اپنے الفاظ کو اسیقدر کوتاہ پاتا ہے۔ آخر مجبور ہو کر دعا کرتا ہے اور جوشِ شوق میں سب کچھ مانگ بیٹھتا ہے، چونکہ مدحت نگاری میں اسکو قصور کا اعتراف ہے، اس لئے ہم مناجات میں اسکو مقابلتہً ؎ دعا قبول ہو یارب کہ عمرِ خضر دراز۔ کا مصداق نہیں کہہ سکتے۔ بلکہ اس کے برخلاف ہم کو یقین ہے کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے۔ غیر ممکن ہی نہیں۔ وقوعی ہے۔ ذیل کی مثالیں اسکی وضاحت کرتی ہیں، جب اُنہیں تم یہ دیکھو گے کہ صرف وہی درخواست کی گئی ہے کہ جو نعت کے اندر کسی حالت میں بھی مبالغہ نہیں کہی جاسکتی، تو تم کو یہ ماننا پڑے گا کہ اسی قسم کی آرزوئیں اور تمنائیں آصفی کے دل میں، دوسرے عاشقانِ رسالت سے کم پیدا نہیں ہوئیں۔ فرماتے ہیں۔

تا در چمن و دشت بود فیضِ بہاراں — از لالہ و گلہائے مطرا، چمن آرا

تا سینۂ کہسار بود خون ز دلِ لعل — تا لعلِ جگر رنگ بر آرند زخارا

بادا رخِ احباب تو در گلشنِ ہستی — از بادۂ عشرت، صفتِ لالۂ حمرا

چوں لعل ز افسردنِ سرنجۂ غم باد — خوں بستہ دل اندر حجرِ سینۂ اعدا

جب تک دنیا میں، بہار کا دور دورہ رہے، اور پہاڑوں میں، پتھر کے اندر سے خونیں رنگ لعل نکلیں، تیرے دوست سُرخ رو اور دشمن، خونیں دل رہیں۔

تا حرف و رقم، مبدءِ اسرارِ کمال اند — با حرف و رقم تا کہ فتد کار قلم را

کلکِ ازلی نقش طراز ندہ کند صرف — در مدحتِ ذاتِ تو، ہمہ حرف و رقم را

جبتک دنیا میں، اسرار و رموز کے اظہار کا ذریعہ تحریر سمجھی جائے، اور تحریر کے لئے قلم درکار ہو، تمام حرف

صرف تیری نعت میں صرف ہوا کریں۔ اور دنیا کو اپنے مطالب کے اظہار کیلئے کوئی حرف نہ ملے۔

بد ہر تا کہ زخوئی ستیزہ کار فلک — شود نزول ز بالا بہ زیر حدثان را
زخوئی فتنۂ و سنگِ حوادثِ گردوں — دلِ شکستہ رواں خستہ باد خصماں را

جبتک آسمان، دنیا پر حوادثات کی بارش کرتا رہے۔ تیرے دشمنوں کے دل زخمی رہیں۔

ہاں آصفی دعا، دم صبح اجابت ست — کز مطلعِ قبول برآرد سر آفتاب
تا از پے صبوحیِ مستانِ صبح خیز — در بزمِ روزگار بود ساغر آفتاب
در محفلِ شہود و بد ساقیٔ ازل — با میکشانِ عشقِ تو از کوثر آفتاب
در جامِ بخت خصمِ تو درد حمیم باد — ہر جرعہ شعلہ قطرہ کند اخگر آفتاب

جبتک دنیا میں سورج نکلتا رہے، تیرے دوستوں کو شرابِ طہور، اور دشمنوں کو پیپ اور لہو پینے کو ملے۔

آصفی گوید دعائے ذاتِ اے ختم الرسل — زاں نمط کز نصِ قطعی ہم لقرآں آمدہ است
باد فرمانِ نبوت، سر بسر ختم تو — تا قضا گوید فلاں رفتہ ست بہماں آمدہ است

جبتک دنیا میں، پیدائش ووفات کا سلسلہ جاری رہے، تیرا شریک نبوت نہ پیدا ہو۔

تا غزالانِ حرم را بنود دام کمیں — تا ز حسرت، دلِ صیادِ ستمگر شکند
چرخ ہر دامِ جفائی کہ نہد در رہِ ہسم — نیروئے عدلِ تو ہر حلقۂ و چنبر شکند

جبتک حرم کی ہرنیاں، شکاریوں پر حرام رہیں، اور جبتک ظالم شکاری انھیں دیکھکر کفِ افسوس ملے، میرے راستہ میں جسقدر مشکلات حائل ہوں، تیرے عدل وانصاف سے سب دور ہو جایا کریں۔

تا کہ دولابِ چرخ گردندہ — دیو زریں بچہ در اندازد
صورتِ دیو مہر، چرخ، بجا — دشمناں را نگوں سر اندازد

جب دنیا میں سورج غروب ہو، آسمان تیرے دشمنوں کو ذلیل وخوار رکھے۔

شود تا شاخِ خشکِ خامہ تر از رشحۂ معنی — کند تا آبیاریٔ مطالب لالہ افشانش
شود گلدستہ گلہائے معنی زیبِ بزمِ او — معطر باد از بویش دماغِ آل و یارانش
پے گلدستہ بندِ نعتِ او از حضرتِ باری — شود فردوس نزدل و باغِ آدا باد رضوانش
رسد با آصفی از فیضِ نقشِ نکہتِ رحمت — پے تعطیرِ مغزِ آرزوی از فیضِ بستانش

تا بہارِ چمن دہر ز ہستی جوشد — تا دہ آب، سحابِ کرمِ فیضِ ازل

لبِ ہر غنچہ، ارم خندہ زفیضت بادا — چو نشاطِ دلِ مخلوق بگلگشت بہار
روزِ محشر زپئے امتِ تو چوں نوروز — عرصۂ حشر بخورشید شود برجِ حمل

تا دلِ پاک تمنا کند از فیضِ ازل — منتہی تا نشود سلسلۂ عہدِ قدیم
تا کشد لقمۂ عصیاں نبوی قعرِ سقر — تا بُرد عفوِ گناہاں اثرِ گاہِ نعیم
بادا احباب ترا گلشنِ فردوس مقام — بادا اعدائے ترا منزلے از قعرِ جحیم

تا فراقِ تو مرا آرد بایجادِ فغاں — تا کہ باشد عرش بود نا نگاہِ پایہائے من
شورِ محشر باد از عشقت نوائے ذوقِ من — صورِ اسرافیل ہم آہنگِ ایں غوغائے من
آستانِ حضرتت بادا مرا دار السلام — عشرت آبادِ تمنا جنت المعلائے من

ان دعاؤں میں، کوئی ایک دعا بھی ایسی نہیں، جسکو ہم یہ کہہ سکیں کہ "مطلب شتر ہے"، اس لئے "حسنِ نیاز" اس کا حریف نہ ہوگا، آصفی مسلمان ہیں۔ عقیدت کیش ہیں۔ عاشق ہیں۔ وہ آرزو کرتے ہیں، کہ رسول اللہ کے دشمن مقہور اور دوست کامگار رہیں۔ یا آپ کی پاک اور مقدس محبت، اُن کے دل کو جلوہ زار بنا دے، یا قیامت میں آپ کے اتباع کرنیوالوں پر رحمت نازل ہو۔ ایک عقیدتمند یہی چاہتا ہے، اور عنقا جیسی چیز کا طالب نہیں، پھر اسکی تحدید میں، جو مدت ذکر کرتا ہے، وہ مثلاً یہ ہے کہ جب سورج طلوع ہوا کرے، یا جبتک نیکی اور بدی بدستور رہے، وغیرہ اس کو دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں، کہ جبتک دنیا کا موجودہ نظام قائم رہے۔ یعنی قیامت تک چونکہ رسول اللہ خاتم النبین ہیں اور آپ کا مذہب عالمگیر قانون ہے، اس لئے یہ دعائیں بالکل ایسی ہیں، جیسے کوئی کہے۔ خداوندا فلاں شخص کو اتنی عمر دے، جتنی وہ پائے گا۔ اور جسطرح یہ محال طلبی نہیں۔ اسی طرح وہ بھی محال طلبی نہیں۔

لیکن اب اس کے مقابل وہ دعائیں رکھی جائیں جو دوسرے ممدوحوں کے حق میں ہیں، تو معاملہ برعکس ہوجاتا ہے وہ معمولی انسان ہیں، اس لئے انہیں ہر صفت، بشرطیکہ وہ پائی بھی جائے بالکل سادہ ہوتی ہے، لیکن شاعر اس نقص کو مٹاتا ہے، اور ممدوح کو محامد کی بلند ترین چوٹی پر بٹھا دیتا ہے، اس حالت میں صرف یہی دعا کہ آپ پھلتے پھولتے رہیں۔ ایسی ہے جو محاورہ نہ ہو، تو قطعاً غیر منطقی ہے، پھر اس پر اس سے کہیں زائد بلند اوصاف کو، اور کہیں مشکل باتوں کو اس کے لئے مانگنا تو بالکل ایسا ہوتا ہے، جیسے کوئی کہے "اللہ میاں تو مجھے خدا بنا دے" ظاہر ہے کہ یہ ناممکن ہے، اور اس قسم کی دعا کرنیوالے کو اگر کچھ ہی نہ کہا جائے تو زبودہ کہتے ہیں۔

لیکن زمانہ کے ہاتھوں مجبور ہوکر، قوم کی بہترین ہستیاں اپنے آپ کو اس ذلیل لفظ کا مصداق بناتی ہیں، چونکہ اس قسم کی مجبوریاں آصفی کو پیش آئی ہیں، اسلئے انکے ہاں بھی مذکورہ قسم کی دعائیں بکثرت ہیں۔ فرماتے ہیں۔

تا بہرۂ ایثار کفِ ہمت نیساں　　گوہر کدہ سازد گہر دامنِ یم را
از دستِ سخا، ہمتِ فیاضِ تو بخشد　　گنجینہ لعل و گہر اصنافِ امم را
در موکبِ اقبالِ تو دوراں پئے نصرت　　رنگیں کند از خونِ عدو، پائے علم را

الٰہی تا کہ در گیہاں، روان ست از قضا فرماں　　ز اجلالِ قدر مہر آں، بود ہر شہ جبیں فرسا
جہاں را او بود آمر، زماں را او بود قاہر　　ز فرمانش شود ظاہر، تسلط بر ہمہ دنیا
ز ملکِ ہند تا دکھن، ز عدلِ او شود گلشن　　جہاں را در کنفش امن، زماں را عتبہ اش ملجا

تا ہست کائنات ز سرچشمۂ وجود　　فیضِ بقا بچشمۂ حیواں برابر ست
تا صبح و شام را فنقِ نور دیرگی　　بہرِ نظامِ عالمِ امکاں برابر ست
بادا بقائے تو بجہاں ہمچو مہر و ماہ　　بارائے تو، قواعدِ گیہاں برابر ست

تا دور آسماں بہ ترقی مساعد ست　　تا پایۂ رفیع بخورشید خاور ست
باشی چو آفتاب، باوجِ سپہر جاہ　　کز بخت تو جہانِ معانی منور ست

تا کہ در عالمِ امکاں بود آثارِ عروج　　و ز رتب فرۂ اجلال باعیاں گردد
آں مراتب کہ بود در خورِ ادراکِ عقول　　از عروجِ تو نشانمند بامکاں گردد

وقت آن ست کہ بالدِ نفسِ عرض دعا　　بہ نیازے کہ اجابت کشد اورا بکنار
شاہ را عمر چناں باد کہ دورِ پیش　　عمرِ صد خضر بصرفِ گرہ آید بہ شمار
سال و مہ، ہفتہ و ہر روز کند جشنِ طرب　　بسر آرد بہ نشاطِ ابدی لیل و نہار
خلق را باد نظامے بہ نظامِ عدلش　　ملک پرداختہ از فتنۂ چرخِ دوّار

تا کہ چکد از سحاب، قطرۂ درِ خوشاب   تا کہ بآں درِ ناب، دہر کند گوشوار
سال و مہت چوں گہر، منتظم یک دگر   چوں قطراتِ مطر، بیش بود از شمار
چرخ کند گوشوار، زاں گہر گشتہ بے شمار   زینتِ لیل و نہار، باد بہ آں گوشوار
ساقیٔ دورِ زماں، از طربِ جاوداں،   با تو دہد شادماں، جام بہ لیل و نہار

تا کہ در عالمِ ایجاد بود عشرت و غم   تا کشد دوست مُی و خصم خورد خونِ جگر
دوستاں را زمۓ عشرتِ کوثر ساغر   دشمناں را قدحِ رمز زقوم سقر
بہرہ یابند زخوانِ کرمت صبح و مسا   در خورِ حوصلۂ خواہشِ خود، اہلِ ہنر

تا کہ گوہر گسلد ابرِ بہاری بصدف   تا شود آبروئے بحر و صدف از گوہر
بہ نثارِ تو قدر گوہرِ شب تابِ نجوم   دائم آرد بکف از دامنِ نجمہ اخضر

تا کہ خواہد شبِ دیجور، در آغوشِ ظلام   تا کہ از چشمِ فلک خواب برد آبِ غطاط
شاہدِ بختِ تو بیدار بماند دائم   باد روز و شبِ تو، روز و شبِ عیش و نشاط

تا کہ خورشید جہانتاب زدورِ عشرت   بہند از حوت بآہنگِ طرب روی بحمل
عہدِ نوروز بود آخرِ عہدِ عشرت   روزِ نوروز بود ثانیٔ و روزت اوّل
تا بود طبعِ سخنور زسخن گوہر زا   تا کہ باشد نسقِ گوہرِ معنی بہ کلام
گوہرِ اہلِ سخن باد نشارِ مدحت   باد آغازِ ثنائی تو زحسنِ انجام
سایۂ ذاتِ تو مبسوط بود بر سرِ خلق   بارگاہِ تو بود مولِ اعیانِ کرام
باد با عمرِ تو عمرِ خضری ہم سوگند   بادۂ عیشِ تو چوں آبِ بقا باد مدام

تا بود دورِ بقا، تا بود دورِ فنا   تا کہ در باغِ جہاں آید بہار و ہم خزاں
گلبنِ ذاتش ہمیشہ بادیتاں از بقا   وز بہارِ عیش صحت باد دائم گلفشاں
تا کہ آبادیٔ و ویرانی ست در ملکِ جور   تا بہ نیرنگی بود برپا طلسمِ آسماں

خلق باد از داد و عدلش کامجوئی کامیاب | ملک باد از نصفت او از حوادث در اماں

ان دعاؤں میں یا تو یہ خواہش ہے، کہ ممدوح کو غیر فانی ہستی عطا کیجائے، اور یا یہ کہ اُس کو وہ مرتبہ ملے، جو ہر بلند مرتبہ شئے سے اعلےٰ ہو۔ اول محال ہے، دوسرا تقریباً غیر ممکن، غیر ممکن یا محال شئے کی طلب میں خلوص پیدا ہونا بھی اسیطرح غیر ممکن یا محال ہے، لیکن چونکہ یہ حصہ قصیدہ کا جز ہے، اور قصیدہ ترقی کرکے سر تاپا غلو ہو چکا ہے، اس لئے اس میں بھی غلو ہی غلو جلوہ گر ہے۔

بعض قصائد میں، آصفی نے ایسی دعا بھی دی ہے، جو تھوڑی سی تاویل کے بعد معمولی بول چال میں شامل ہو جاتی ہے۔ مثلاً

تا در حرم و دیر بود رسم پرستش | معبودِ حقیقی و دگر سنگِ صنم را
اندر حرم سینہ و ہر شام و سحرگاہ | چوں شمعِ حرم، قلبِ تو انوارِ قدم را

مقصد یہ ہے کہ تیرا سینہ نورِ ایمان سے روشن رہے۔ لیکن شاعرانہ ادا نے اس کو ذرا نثر سے الگ کر دیا ہے فرماتے ہیں "جبتک دیر و حرم میں خدا اور برق کی پرستش ہو، تیرا دل، شمعِ حرم کی طرح سینہ کو انوارِ الٰہی سے روشن رکھے" یا فرماتے ہیں۔

تا صوم و صلوٰتے و دگر حج و زکاتے | از طاعتِ خلاق کند عرض نشاں را
بر کام دلِ صائم امید فزائید | ابروئے آمیشِ مہِ عیدِ رمضاں را
اقبالِ ترا سلسلۂ عہد ابد باد | چندانکہ بود سلسلۂ دور زماں را
در عہدِ تو پیوستہ ز قانونِ عدالت | بر دامنِ تو دوراں نگزیند حدثاں را

یعنی "جب تک دنیا میں، خدا کی پرستش و بندگی میں نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ داخل رہیں، تیرا اقبال پائندہ اور تیرا عدل عالمگیر رہے۔ امیدوار تجھے دیکھے، تو ایسی خوشی محسوس کرے، جیسے روزہ دار عید کا چاند دیکھکر باغ باغ ہو جاتا ہے" بالفاظِ دیگر تو سدا اقبال مند، عدالت شعار اور کرم گستر رہے۔

اسی مضمون کی مختصر دعا۔ ان الفاظ میں نظم فرماتے ہیں۔

تا ہلالِ عید باشد در جہاں عشرت نوید | تا کہ باشد از نشاطِ عید صائم کامیاب
ابروئے اقبال او در آسمانِ عز جاد | چوں ہلالِ عیدِ عشرت باد بہر شیخ و شاب

تا بود سلطانِ انجم بر سپہرِ چار میں | از جلال و احتشامِ خویشتن گردوں جناب
بارگاہِ افسر الدولہ بہادر در دکن | بہر اعیاں ملجا و بہر سراں باد آماب

دشمنان سوزند اندر آتشِ رشکش چو عود		ناکساں نالند از غم صورتِ چنگ و رباب

یعنی جبتک، آسمان پر آفتاب جلوہ فگن رہے، تیری بارگاہ، اعیانِ ملک و قوم کا ملجا رہے، اور دشمن آتشِ حسد سے جل بھن کر خاک ہو اڑیں۔

تا نسق را بہرِ کن شیوۂ تجدید بود		تا مدارِ نسق و نظمِ بعقلِ دانا ست

بہرِ ہر نظم و نسق بار بعقلِ تو مدار		حکمراں تا کہ نظامِ دکن ملک آراست

یعنی جبتک، دکن میں نظم و نسق کے نئے نئے طریق پیدا ہوتے رہیں، اور دنیا عقل کو مدارِ انتظام شمار کرے ہر موقعہ پر صرف تیری ہی عقل راہنمائی کرے۔

بود تا کہ دورِ سپہرِ کبود،		رسد تا بہ گیتی بہارِ لبنست

بہ بزمِ وزیرِ دکن پیشکار،		بہاراں شود پیشکارِ لبنست

بمدحش نئے خامۂ آصفی		شود ملبلِ نو بہارِ لبنست

یعنی تیری بزم سدا تر و تازہ رہے، اور آصفی کے اشعار سے ہمیشہ مالامال۔

تا قضا دفترِ ایجاد طراز دبو		داورِ گاہ بدیوانِ قضا تا بنشیند

تا براتِ اہلِ اہلِ جہاں بنویسد		تا کہ از خامۂ قدرت خطِ اجرا بنشیند

سرورِ جنگ، بود قاسمِ ارزاقِ جہاں		بہرہ بخت از و مخلص و اعدا بنشیند

نخلِ بخشش کہ خورد آب ز جوئے اقبال		ثمر افشانِ کمالِ جمِ و دارا بنشیند

یعنی سرورِ جنگ کے ہاں سدا لنگر جاری رہے، جس سے دوست دشمن، سب فیضیاب ہوں، اور تا ابد جمشید و دارا کی طرح صاحبِ اقبال رہے۔

تا کہ میدارد تسلسل زلفِ عمرِ کائنات		زلفِ عمرت چوں حیاتِ خضر طولانی کند

تا کہ زلفِ شاہدِ کشور بدستش روزگار		گر جمعیت بود گاہے پریشانی کند

زلفِ رعنا شاہدِ ملکِ دکن مجموع باد		عدل و انصافِ تو دائم شانہ گردانی کند

مقصد یہ ہے کہ خدا آپ کی عمر بڑھائے، اور عدالت کی توفیق دے۔

مولانا شبلی مرحوم کو دعا دیتے ہیں۔

جائے شبلی بدکن باد چو بلبل بچمن		کز نوا سنجی او رونقِ بستاں آمد

نواب ماہر جنگ کے لئے آرزو ہے کہ

فلکِ مراتبِ او آنقدر کہ افزاید		بروں ز دائرۂ عقلش انحصار کند

خدا آپ کو اسقدر مراتب عطا کرے کہ ہم گن بھی نہ سکیں۔

نواب فخر الملک وزیر تعلیمات سے خطاب کرکے فرماتے ہیں۔

تا کہ از لیل و نہار ست نظامِ عالم　　تا بود مہر و مہ و گردشِ چرخِ دوار
جمع آیند بدرگاہِ تو اصحاب علوم　　کام یابند ز جود و کرمت لیل و نہار
ہمچو خورشید فروزندہ جہاں آرا باد　　نیّرِ رائے نیّرِ تو ز نور الانوار

مقصد یہ ہے کہ سدا تیری مجلس میں علما اور فضلا کا مجمع رہے۔ اور تیری روشن رائے سورج کی طرح سب سے ممتاز ہو۔
مذکورہ بالا مثالوں میں، آصفی نے یہ کوشش کی ہے کہ ان کی دعائیں صرف معمولی مبالغہ ہو۔ ہمارا خیال ہے کہ وہ کامیاب بھی ہو گئے، ان کے کلیات میں اس قسم کی اور مثالیں بھی بکثرت ملتی ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حتی الامکان قدیم شاہراہ سے الگ چلنا چاہتے ہیں۔

یہاں بظاہر یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ ان دعاؤں میں بھی کافی غلو ہے۔ اسلئے کہ تقریباً ہر جگہ یہی کہا گیا ہے، کہ جب تک سورج طلوع ہو، یا حوادث نازل ہوں، یا جبتک یہ نظام عالم قائم رہے، وغیرہ پھر ان مثالوں کو واقعاتی کسطرح کہا جا سکتا ہے۔

لیکن اگر ذرا بھی دقتِ نظری سے کام لیا جائے۔ تو مسئلہ حل ہو جاتا ہے، مدعا یہ نہیں کہ کلام مبالغہ سے خالی ہو جائے مقصد یہ ہے کہ جو دعا دیجائے وہ دعا غلو نہ ہو۔ رہی تحدید وقت تو وہ کتنے ہی سیدھے سادے الفاظ میں ہو غلو ہی رہیگی۔ مثلاً صرف یہی کہدیا جائے کہ "سدا ایسا ہو جیو" تو یہ بھی حقیقتاً واقعیت سے دور ہے ——— پہلی مثالیں واقعیت آشنا آرزو سے خالی ہیں، ان میں اسقدر حقیقت سے دور راستہ اختیار کیا گیا ہے، کہ صاف بناوٹ نظر آتی ہے، اسکے برخلاف ان خواہشوں میں ذرا سی فکر بھی درکار نہیں ہوتی۔ سامع سنتا ہے اور محسوس کرتا ہے کہ با اثر ہے۔ یہ کیوں، صرف اسلئے کہ اگر زیادہ سے زیادہ کچھ طلب کیا ہے تو اقبالمندی۔ عدالت شعاری وغیرہ، رہی درازیٔ عمر، تو اولاً تو اسکے لئے براہِ راست کوئی خواہش ہی نہیں اور اگر ہے بھی تو تشبیہ کے سہارے، یعنی خضر کی طرح بڑی عمر ہو۔ چونکہ تشبیہ کے لئے صرف معمولی وجہ شبہ کافی ہے، اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں، "مقصد یہ نہیں ہے کہ عمر بالکل خضر کی برابر ہو، بلکہ جسطرح انکی عمر دراز ہے، ممدوح بھی بڑی عمر پائے۔"

تبصرہ کے ان صفحات میں، مولانا آصفی کے قصائد کے اجزا اور خصوصیات کا ہر ہر پہلو روشن ہو چکا ہے، بات حد سے زائد بڑھ گئی، اس لئے ہم علٰحدہ علٰحدہ، تخیل، تشبیہ، زور، اور چستی وغیرہ کی مثالیں نہیں دیتے۔

خان امتیاز علی عرشی

ایک تصویر کی قیمت

(ایک المیہ رومان)

بادشاہ کے محل میں ایک ہندو خادمہ چمپا بھی تھی، جسپر لوگ کسی قدر تعجب کا اظہار کرتے تھے۔ حالانکہ محل میں اسکے آنے کا واقعہ ایک ایسا سادہ سا واقعہ تھا کہ حیرت کی کوئی بات اسمیں نہیں ہو سکتی۔ نواب کے محل کی ایک خادمہ پنّا جب اپنے بھائی سے ملنے گئی تو اُسکو معلوم ہوا کہ پڑوسن آج ہی صبح ایک بچی چھوڑ کر مر گئی ہے، اور اس کا کوئی نگراں نہیں ہے۔ اسنے ترس کھا کر اس لڑکی کو اپنے آغوش میں لے لیا اور اپنے ساتھ نواب کے محل میں لے آئی۔

جب محل میں یہ لڑکی داخل ہوئی تو دوسری کنیزوں نے پنّا کی اس حرکت پر بہت ہنسی اُڑائی اور بیٹھے بٹھائے ایک مصیبت مول لینے پر اسکی بہت تضحیک کی۔ لیکن پنّا کے کوئی اولاد نہ تھی، اسلئے وہ بے یار و مددگار چمپا کی معصومانہ آنکھیں دیکھکر ان تمام باتوں کو فراموش کر دیتی تھی اور اس بچی کی پرورش کر رہی تھی،

پنّا سب سے بڑی بیگم کی منھ چڑھی خادمہ تھی، اسلئے اسے کام بہت ہی کم کرنا پڑتا تھا اور تنخواہ سب سے زیادہ ملتی تھی۔

پنّا کی پرورش گو حرم کی زہریلی فضا میں ہوئی تھی، مگر چمپا پر اس کا اثر نہیں ہوا تھا، چونکہ پنّا اب بہت نحیف و ضعیف ہو گئی تھی، اس لئے اس کا بہت سا کام نوجوان چمپا کو انجام دینا پڑتا تھا۔ نواب شہنشاہ بیگم چمپا کو کسی قدر التفات کی نظروں سے دیکھتی تھیں، کیونکہ اسوقت اس کے محل میں یہی ایک مکیں ایسی تھی، جسپر مکان کو فخر ہو سکتا ہے، جوں جوں بیگم کی عمر میں اضافہ ہوتا گیا، اسکی محفلیں سرد پڑتی گئیں۔ حتیٰ کہ نواب نے بھی آنا جانا کم کر دیا، ایک وقت تھا جب اس کا حجلۂ شباب روشنی سے جگمگاتا اور پھولوں سے معطر ہوتا تھا، مگر اب یہ حالت تھی کہ روشنیاں شام ہی سے گُل کر دی جاتی تھیں اور مرجھائے ہوئے پھول فرش پر بکھرے رہتے تھے۔

البتہ نوجوان شہزادے کی محفلیں ضرور جگمگانے لگیں، جہاں نہ کبھی روشنیاں گُل ہوتی تھیں اور نہ پھول مرجھاتے تھے، شہزادہ کے لئے اور زیادہ کنیزوں کی ضرورت روز بروز محسوس ہونے لگی اور محل کے ہر ہر گوشہ کا حسن و جمال کھنچکر اس کے قصر میں آگیا، صرف چمپا ہی ایک ایسی نوجوان کنیز تھی جو بوڑھی بیگم کے محل میں تنہا رہ گئی تھی۔ چمپا پر کام کا بار بہت تھا،

لیکن جب ضروری کاموں سے اسکو فرصت ملتی، تو وہ بیگم کے پاس زردوزی اور کشیدہ کاری کا کام بھی ضرور سیکھتی تھی۔ بوڑھی بیگم شباب رفتہ کی شاکی اور خاوند کی محبت و التفات سے محروم تھی، وہ عیش و عشرت سے تنگ آگئی تھی اور عمر کے آخری ایام اس لڑکی کے ساتھ گذارتی تھی تاکہ اُس کا دل بہلتا رہے، اور ایام رفتہ کی یاد دل سے دور ہوجائے، وہ چمپا کو زردوزی بہت شوق سے سکھاتی تھی، جسکی وہ اچھی ماہر تھی

جب شام ہونے لگتی اور غبار شب محیط ہونے لگتا تو زردوزی کا مشغلہ بھی مجبوراً بند کردیا جاتا تھا، کیونکہ جب آسمان کے سیاہ مخملی غلاف میں زرتار تارے چمکنے لگتے تو زردوزی کے روپہلے اور سنہرے تاروں میں تمیز کرنا دشوار ہوجاتا تھا۔

چمپا اپنی خدمات سے فارغ ہونے کے بعد محل سے نکلکر اس غلام گردش میں چلی جاتی تھی، جہاں سامنے ہی نوجوان شہزادہ کا محل تھا، اسے اس محل کی کھڑکیوں سے رنگین روشنی دکھائی دیتی اور پھولوں کی رومانی خوشبو آتی، اور گانیکی آوازیں اسکے دل میں ایک تلاطم سا پیدا کردیتی تھیں۔

مریم اور گلابی شہزادہ کی نئی کنیزیں کبھی کبھی اسکے پاس آجاتی تھیں، اور شہزادہ کے حرم میں جو جو کچھ ہوتا تھا وہ سب چمپا کے سامنے دُہراتی تھیں۔

ایک صبح جب چمپا اُٹھی تو محل میں اُسے غیر معمولی چہل پہل نظر آئی، اور اُسے معلوم ہوا کہ بادشاہ اور اُسکا نوجوان شہزادہ آج محل میں آنیوالے تھے۔ بیگم ان دونوں کے خیر مقدم کے لئے تیاریاں کررہی تھیں، چمپا بھی تیاری میں مصروف تھی۔ لیکن آج اُس کا دل کام میں نہیں لگتا تھا وہ آج کوئی غیر معمولی بےچینی محسوس کررہی تھی،

(۲)

چمپا رات کی آمد کا بےچینی سے انتظار کررہی تھی، وہ محل کے کمروں میں مضطرب پھر رہی تھی، بیگم کے لبوں پہ ایک مسکراہٹ تھی، وہ خوش تھی کہ اُسے پھر ایک بار بادشاہ (اپنے شوہر) کا التفات نصیب ہوا۔ مگر چمپا کا دل خدا جانے کیوں بیٹھا جارہا تھا۔ کہ دفعتاً کمروں کے اندر سے ستار کی سُریلی آواز بلند ہوئی اور قبل اس کے کہ چمپا کسی دروازے کے پیچھے چھپ جاتی، بادشاہ معہ شہزادہ کے اسکے سامنے سے گزرا، چمپا نکلکر باغ میں ایک جگہ جا بیٹھی تاریکی اسکے چاروں طرف محیط ہوگئی، ہوا نے گلاب کی کٹوریوں کو متحرک کیا، مگر چمپا بےحس و حرکت بیٹھی رہی۔

شہزادہ کو اپنی ماں کا محل کچھ پسند نہیں آیا، وہ اِدھر اُدھر اضطراب کے عالم میں ٹہل رہا تھا، بادشاہ کی عمر مضطرب ہونیکی نہ تھی، اسلئے وہ ایک مکلف کوچ پر پڑا ہوا رقص دیکھ رہا تھا، ماں نے لڑکے کے اضطراب و پریشانی کو تاڑ لیا، اُسکے محل میں متعدد چیزیں دیکھنے کے قابل تھیں، ضرورت تھی کہ کوئی اسے لیجا کر سب چیزیں دکھا لائے۔ خود وہ نہیں جاسکتی تھی۔ کیونکہ بادشاہ کو کیونکر اکیلا چھوڑا جاسکتا تھا، کنیزیں اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھیں۔ چمپا کہیں دکھائی نہیں دی۔ بیگم نے جالیوں میں سے جھانک کر اُسے پکارا۔ اور بادل ناخواستہ چمپا نے دمکتے ہوئے ستاروں کے سے

اپنی نظریں ہٹائیں اور آہستہ آہستہ محل کی طرف چلی۔

جونہی وہ کمرہ کے دروازہ پر پہونچی، بیگم نے حکم دیا "شہزادہ کو مشرق کی جانب لیجاؤ اور سب چیزوں کی سیر کراؤ۔ ایک شمع ساتھ لیلو"

شہزادہ نے چمپا پر ایک غلط انداز نظر ڈالی، اور چمپا نے شمعدان اُٹھایا اور شرمائی ہوئی آگے بڑھی اور شہزادہ پیچھے پیچھے۔ متعدد کمرے دکھائے گئے، کسی میں قیمتی ہاتھی دانت کا سامان تھا، اور کسی میں کشمیر کے زرکار کپڑے اور کشیدہ کاری کے عمدہ نمونے۔ غلام گردش کے سب سے آخری کونہ میں ایک چھوٹا سا کمرہ تھا، جس میں قفل لگا ہوا تھا، جہاں تک چمپا کی یاد کام کرتی تھی، اُس نے اسے ہمیشہ مقفل دیکھا تھا، شہزادہ اس دروازہ کے سامنے پہونچکر رُک گیا اور پوچھا "یہ بند کیوں ہے؟ اس میں کیا ہے؟" چمپا اپنے دل میں جواب کے لئے مناسب الفاظ سوچ ہی رہی تھی کہ بوڑھی پنا لکڑی ٹیکتی ہوئی ایک طرف سے برآمد ہوئی، شمعدان کی ناکافی روشنی اس وسیع جگہ کو روشن نہیں کرسکتی تھی، اس تاریکی میں پنا کا سفید سر اور جھریاں پڑا چہرہ ایک عجب سماں پیدا کر رہا تھا، شہزادہ یہ منظر دیکھکر ڈر گیا، اور کسی قدر خوف زدہ ہوکر پیچھے ہٹ گیا۔

(۳)

بوڑھی خادمہ جھک کر آداب بجالائی، اور بولی کہ "حضور! آپ خوفزدہ نہ ہوں میں آپکی پُرانی خادمہ پنا ہوں میں آپکی دایہ ہوں، لیکن اب میری صورت بدل گئی ہے، آپ چمپا سے اس کمرہ کی بابت پوچھتے ہیں۔ حضور! بھلا اُس لڑکی کو کیا معلوم ہوسکتا ہے؟ جس ہولناک واقعہ کے بعد یہ دروازہ ہمیشہ کے لئے مقفل کیا گیا تھا، اسے ایک زمانہ گذر چکا ہے، اُسوقت میں جوان تھی، اسکی کنجی میرے پاس ہے، میں اسے پچاس سال سے محفوظ رکھے ہوئے ہوں، شاید آپ نے اپنے دادا کی پُراسرار موت کا حال تو سُنا ہوگا۔ اسکی تصویر آپ کے تصویر خانہ میں نہیں ہے، کیا آپ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ اسکی تصویر کہاں ہے؟"

شہزادہ نے سر ہلایا، معلوم ہوتا تھا اُس سے قوت گویائی چھین لی گئی ہے۔ بوڑھی خادمہ نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کنجی نکالی اور قفل کھولا، کمرہ کا دروازہ بغیر کسی دقت کے کھل گیا، شہزادہ باہر کھڑا رہا، خادمہ اندر گئی اور وہاں سے پکارا۔

چمپا جو بُت بنی کھڑی تھی چونک پڑی اور شمعدان لئے ہوئے اندر داخل ہوئی، اس کے پیچھے شہزادہ داخل ہوا، کمرہ آراستہ تھا، لیکن مخمل کے پردوں کا رنگ اُڑ چلا تھا، دیوار کے قریب ایک بڑا عروسی پلنگ رکھا ہوا تھا جس پر پژمردہ پھولوں کے ہار بے ترتیبی سے پڑے ہوئے تھے، اُسکے قریب ہی دیوار پر ایک قد آدم آئینہ آویزاں تھا۔ کسی سخت ضرب کی وجہ سے اسکے دو برابر کے حصے ہوگئے تھے، فانوسوں کا عکس آئینہ کے دونوں حصوں پر پڑ رہا تھا۔

جونہی شہزادہ کمرہ میں داخل ہوا اُسکا عکس اس آئینہ میں پڑا، چمپا دفعتاً چونک پڑی، کیونکہ آئینہ میں شہزادہ کے عکس کے علاوہ اسی کی شکل و شمائل کا ایک دوسرا عکس بھی پڑ رہا تھا۔ شہزادہ کے پیچھے ایک اور ویسا ہی عکس تھا اس نے پلٹ کر پیچھے دیکھا، لیکن شہزادہ کے علاوہ اور کوئی نظر نہیں آیا۔

پنّا کی آواز پھر کمرہ میں سُنائی دی، "حضور دیکھیے آئینہ کے عین سامنے آپکے دادا کی شبیہ لٹک رہی ہے اور وہ شکستہ آئینہ میں آپکو نظر آرہی ہے، جب یہ تصویر بنی تھی اُسوقت اُنکی عمر آپ ہی کے برابر تھی، لیکن اسکے تھوڑے ہی عرصہ بعد وہ ہولناک رات آئی جس نے ہمیں اُن سے جُدا کردیا"

یہ کہکر تمام مجمع تصویر کی جانب بڑھا۔ یہ کوئی روغنی تصویر نہ تھی بلکہ کسی صناع نے نیلگوں مخمل پر سُنہرے روپہلے تاروں سے اسکی خوبصورت شبیہ کاڑھی تھی، زردوزی کا شاہکار تھا، یہ تصویر اب بھی جاندار معلوم ہوتی تھی امتدادِ زمانہ سے کام دھندلا سا معلوم ہوتا تھا۔

مجمع میں سے کسی نوجوان لڑکی نے کہا "کیسی خوبصورت تصویر بنائی ہے، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ انسان ایسی چیزیں تیار کرسکتا ہے۔ معلوم نہیں یہ کس نے بنائی ہے؟"

بوڑھی عورت نے جواب دیا، "اسکا بنانیوالا عرصہ ہوا مرگیا، وہ اپنے فن کا اُستاد تھا اُس نے یہ تصویر نا تمام چھوڑی، کیونکہ قبل اسکے کہ یہ پایۂ تکمیل کو پہونچے اُسکی بینائی نے جواب دیدیا، کچھ عرصہ بعد اس کا انتقال ہوگیا، لیکن اُس کے بیٹے نے اسکو پورا کردیا"

نوجوان لڑکی بولی، "اسکا اندھا ہوجانا یقینی تھا! میں اپنی بصارت اس شخص کی تصویر بنانے کے لئے دینے کو تیار ہوں جو اسی کی برابر خوبصورت ہے"! لڑکی کی متبسم نظریں شہزادہ کی طرف مائل تھیں

شہزادہ اپنے دادا کی شبیہ کو ایک سرد مہر نقاد کی طرح دیکھ رہا تھا، تھوڑی دیر بعد اسکی نظریں ادھر سے ہٹیں اور کہا "امینہ! محض خوبصورت ہونا ہی کام نہیں دیتا ویسی ہی قسمت بھی ہونی چاہیئے، تم اپنی مرضی سے مجھپر اپنی آنکھیں قربان کرسکتی ہو، لیکن تم میں وہ جوہر نہیں ہے اور اگر کوئی ایسا ماہرِ فن مل بھی جائے جو ایسی ہی شبیہ مخمل پر کاڑھ سکے تو وہ کب اپنی آنکھیں برباد کرنی گوارا کرے گا"

امینہ نے ہنسکر جواب دیا۔ "اگر کوئی ایسا قربانی کرنیوالا مل جائے تو آپ کیا دینگے؟"

شہزادہ نے بھی جواب دیا۔ "کیا دونگا؟ سب کچھ جو میرا ہے"!

اب کوئی چیز دیکھنے کے لئے باقی نہ رہی تھی اس لئے سب لوگ رخصت ہوگئے۔

رات کو جب روشنیاں گُل ہوگئیں، چمپا غلام گردش کو طے کرکے پنّا کے آخری کمرہ کی جانب جاتی ہوئی دکھائی دی۔ جونہی چمپا کمرہ میں داخل ہوئی وہ چلاّئی "ہائیں! اسوقت تم یہاں کیوں آئی ہو؟"

چمپا نے پوچھا "وہ شخص جس نے نواب کی تصویر کی تکمیل کی تھی اب کہاں ہے؟"

بوڑھی عورت نے پہلے تو چمپا کی طرف متحیر ہو کر دیکھا اور پھر کہا "کیا تو اس سے زردوزی کا کام سیکھنا چاہتی ہے! ناداں لڑکی اس خیال خام سے باز آ ورنہ یاد رکھ کہ اگر ایسے مہلک کام میں ہاتھ ڈالا تو دو ہی سال کے اندر اندر تیری بینائی جاتی رہیگی، تو نے بیگم سے جتنا سیکھ لیا اسی پر اکتفا کر۔ رحمت جس نے تصویر کو مکمل کیا تھا، بینائی کے ضائع ہونے کے خوف سے اس کام سے دست بردار ہو گیا ہے! اور اب آگرہ میں ہے"۔

چمپا نے بوڑھی کے گلے میں بانہیں ڈالدیں اور کہا "بس اب میں جاتی ہوں"!

شام سے طوفان کے آثار تھے، لیکن اب سکون تھا، گلابی باغ میں زرد پتے اپنا جنونانہ رقص ختم کر چکے تھے ایک لڑکی کا نازک جسم گلاب کے کنجوں میں سے گذرتا ہوا دکھائی دیا اور پھر وہی سکون طاری ہو گیا۔

(۴)

گذشتہ ساٹھ سال کی زندگی میں رحمت کو کبھی اس سال کی سی سردی کا تجربہ نہ ہوا تھا، جب سے وہ آگرہ میں آکر رہا تھا، ہمیشہ سردی کی شکایت کرتا تھا، لیکن امسال تو وہ بالکل ٹھٹھرا جا رہا تھا۔

جب سورج بلند ہوا وہ اپنی چارپائی سے اٹھا لیکن قبل اسکے کہ وہ ضروریات سے فارغ ہوتا، دفعتاً دروازہ کھلا اور کوئی شخص اندر داخل ہوا، جسکے بعد ایک خاموشی چھا گئی۔ رحمت نے متعجب ہو کر اپنی آنکھیں کھولیں کیونکہ اس کے دوستوں میں سے کسی کو بھی خاموشی کی عادت نہ تھی۔ پہلے تو رحمت یہ سمجھا کہ سن وسال کا تقاضہ ہے اور اسے کوئی دھمی شکل دکھائی دے رہی ہے مگر مسلسل گھورنے کے بعد اسے یقین ہو گیا کہ سامنے نیلگوں چادر میں لپٹی ہوئی ایک عورت کھڑی ہے۔ رحمت ایک نوجوان لڑکی کو اپنے کمرہ میں دیکھکر کسی قدر پریشان ہوا، وہ متحیر تھا کہ اسوقت کیا کرے کہ نووارد نے پوچھا "کیا جناب یہی رحمت علی کا مکان ہے؟"

"ہاں! میں ہی رحمت ہوں! تم کہاں سے آئی ہو؟" رحمت نے کسیقدر حواس مجتمع کر کے جواب دیا۔

"میرا نام چمپا ہے۔ میں بادشاہ کے محل سے آئی ہوں"!

(۵)

یہ سنکر رحمت کو ایک ایک کر کے جوانی کے تمام واقعات یاد آنے لگے۔ اس نے لڑکی سے پوچھا "تم کیا چاہتی ہو، تمہیں کس نے بھیجا ہے؟"

"کسی نے نہیں۔ میں اپنے کام کے لئے آئی ہوں۔ میں آپ سے کچھ متوقع ہوں"۔

رحمت نے سوچا شاید یہ کوئی بھکارن ہے، مانگتی ہوئی آگرہ آ گئی ہے، رحمت نے کسیقدر نرم لہجہ میں کہا "بیٹی! تم مجھ سے فقیر سے کیا متوقع ہو، مجھے روح وجسم کا تعلق قائم رکھنے کے لئے خود دوسروں کا دست نگر رہنا پڑتا ہے، یہاں امیروں کے مکانات بھی ہیں وہاں جاؤ شاید تمہاری مدد ہو جاوے گی"۔

لڑکی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "میں تم سے روپیہ کی بھیک نہیں مانگتی۔ میں تم سے اس سے زیادہ کی متوقع ہوں، مجھے زردوزی سکھا دو"!

زردوزی! رحمت خوفزدہ ہوا کیونکہ اُس نے آنکھوں کے ضائع ہونے کے خوف سے عرصہ ہوا اس فن کو خیرباد کہہ رکھا تھا، مگر اب بھی کبھی کبھی ایک آدھ ٹانکا بھر لیا کرتا تھا تاکہ مشق نہ چھوٹے، اس لڑکی کی درخواست نے اسکی جوانی کے تمام تاثرات کی تجدید کردی اور وہ زردوزی کے لئے اپنے اندر ایک نیا جوش محسوس کرنے لگا۔ اُس نے لڑکی کو اپنی شاگردی میں لیلیا اور پہلا سبق دیا۔

رحمت کے گھر میں چونکہ کوئی عورت نہ تھی، اسوجہ سے چمپا کو فاطمہ نامی ایک عورت کے ہاں جاکر رہنا پڑا، جو رحمت کے ہاں کام کاج کرنے کبھی کبھی آیا جایا کرتی تھی۔

اسی طرح چمپا کو رہتے ہوئے عرصہ گذر گیا لیکن تصویر بنانیکی ابھی تک نوبت نہ آئی، کیونکہ اُستاد نے ابھی اسکا امتحان نہیں لیا تھا، چمپا بہت محنت و عرق ریزی سے مختلف قسم کے پھول، بیل بوٹے، اور جانوروں کی شکلیں بنالیتی تھی، لیکن اسکا دماغ ہمیشہ محل کے اس کمرہ میں چکر لگاتا رہتا تھا جہاں خوبصورت زردوزی تصویر آویزاں تھی۔

(۶)

اسی طرح چمپا پر زندگی کا پورا ایک سال ختم ہوگیا اور اس زمانہ میں اُس نے اسقدر محنت کی کہ تاج محل کی زردوزی کی تصویر اُس نے تیار کرلی، جسے اُستاد نے بہت پسند کیا اور اُسے امید ہوئی کہ اب وہ شہزادہ کی تصویر بنانے میں کامیاب ہوجائے گی۔

اُسے بصارت ضائع ہونے کا خوف ابتدا ہی سے تھا، اسلئے اب وہ بہت محتاط ہوگئی تھی اور رات کو کام کرنا چھوڑ دیا تھا، اُسے شہزادہ کی تصویر تیار کرنا تھی اس لئے وہ اپنی آنکھیں کھونے کے لئے تیار نہ تھی، وہ اب صرف دن کی تیز روشنی میں کام کیا کرتی تھی۔

چمپا کا اثاثہ چند دنوں کے بعد کم ہونے لگا، فاطمہ نے مزید روپیہ کی فرمائش کی جسے چمپا پیش کرنے سے قاصر تھی، چمپا نے ایک وقت کھانا بند کردیا اور دیگر اخراجات میں بھی کمی کردی مگر تصویر بنانے کے لئے سنہرے رو پہلے تار ضرور کہیں نہ کہیں سے مہیا کرتی۔

ایک وقت کھانے اور شب و روز کی محنت کرنیکی وجہ سے چمپا کی صحت نے جواب دینا شروع کردیا، کیا رحمت کی تنبیہ صحیح تھی کہ ضرورت سے زیادہ محنت کی وجہ سے وہ آنکھیں کھو بیٹھیگی؟ ہاں! اُسے اب شبہ ہونے لگا تھا، کیونکہ وہ محسوس کررہی تھی کہ اُسکی بصارت روز بروز کم ہورہی تھی۔ وہ اب کام میں بھی بہت غلطیاں کرتی تھی، تصویر ختم ہونے میں ابھی کافی عرصہ تھا اب اُس نے رات کو مٹی کے چراغ کے سامنے کام کرنا شروع کردیا، کیونکہ دنکو سورج کی چمک سنہرے تاروں پر پڑکر اُسکی

آنکھوں میں چکاچوند پیدا کرتی تھی۔

دن رات محنت کرنیکی وجہ سے اسکی آنکھوں سے پانی بہنے لگا، مگر تصویر اب قریب الختم تھی، خزاں کا موسم تھا رات بھیانک اور ڈراؤنی تھی اور وہ جلد جلد سوئیاں نکال رہی تھی، آج کی رات اسے وہ طوفانی رات یاد آئی جب وہ محل سے رخصت ہوئی تھی۔

چمپا اب آگرہ سے رخصت ہونیکی تیاریاں کر رہی تھی کیونکہ تصویر ختم ہونیوالی تھی۔ فاطمہ صبح ہوتے ہی کہیں باہر نکل گئی اور چمپا اپنا کام لیکر بیٹھ گئی۔ اب عمل کی تکمیل ہو رہی تھی۔ یکایک اُسے محسوس ہوا کہ تاریکی نے ادھر اُدھر سے بڑھنا شروع کیا، اسنے سوچا ابر آیا ہے مگر جب اس نے باہر نکل کر آسمان کو دیکھا تو وہ بالکل صاف تھا، وہ پھر کمرہ میں آبیٹھی اور کام میں لگ گئی۔ تاریکی پھر عود کر آئی اور اُس نے آنکھیں ملکر ادھر ادھر دیکھا مگر اُسکی آنکھیں دھندلی سی تھیں، کیا وہ مصیبت جسنے دور کرنیکے لئے اُسنے انتہائی کوشش کی تھی اب آنیوالی تھی؟

چمپا خوفزدہ ہو گئی کیا اُسکی آنکھیں نور بصارت سے محروم ہو رہی تھیں، کیا اسکی زندگی کا سرمایہ چند آخری ٹانکوں سے محروم رہیگا؟ کیا شاہکار زندگی ناتمام رہیگا؟ کیا وہ نذر پیش نہ کر سکیگی؟ یہ خیالات تھے جو چمپا کے دماغ پر چھا گئے۔ اور وہ چکرا کر فرش پر گر پڑی۔

تھوڑی دیر بعد وہ ہوش میں آئی، اسوقت اُسکے سامنے شہزادہ کی تصویر تھی۔ اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ وہ خوبصورت شہزادہ سامنے کھڑا ہوا تھا، تصویر ہر طرح مکمل تھی —— مگر آنکھیں جیسی وہ بے کیف تھیں! تصویر کی آنکھیں بیجان اور مُردہ تھیں، ان میں جسم کے بقیہ حصوں کی سی حیات نہ تھی، کیا چمپا اپنی زندگی کی قربانی سے ان آنکھوں میں حسن پیدا کر سکتی تھی؟

چمپا نے ایک غیر انسانی قوت کے ماتحت حواس کو مجتمع کیا اور مخمل لیکر کھڑکی کے قریب روشنی میں آبیٹھی۔ کمرہ کی تاریکی ہر طرف سے ہجوم کر رہی تھی، آج چمپا اس بے بہا مخمل میں اس خزانہ کو منتقل کر رہی تھی جو اسکے نہاں خانۂ دل میں عرصہ دراز سے پوشیدہ تھا —— آہ وہ نظریں! —— شہزادہ کی مخمور نگاہیں تو اسوقت تک صرف چمپا کے اعماق دل میں پنہاں تھیں، آج مخملی سطح پر بادی صورت میں تبدیل ہونیوالی تھیں۔ سنہرے ٹانکے سیاہ مخمل پر اسطرح متحرک تھے گویا تاریک آسمان پر بجلی کوند رہی تھی۔ آخری ٹانکا ختم ہوتے ہی خوبصورت شہزادہ کی آنکھیں چمک اُٹھیں —— اب اُنمیں جان تھی!

چمپا نے سوئی ہاتھ سے رکھدی اور متبسم ہو کر اپنے شاہکار کو اُٹھایا اور نگاہ سے دور رکھکر دیکھا —— ایک بجلی سی کوندی اور پھر اسکے بعد تمام کائنات پر ایک سیاہ پردہ آہستہ آہستہ گرنے لگا!

(۷)

ابھی تک پو نہیں پھٹی تھی اور ستارۂ صبح اپنی آخری کرنیں زمین پر ڈال رہا تھا کہ ایک تاریک ودلدلی سڑک پر سے دو عورتیں گذرتی ہوئی نظر آئیں، ایک بڈھی تھی دوسری جوان۔ بڑھیا کی بغل میں ایک بنڈل تھا اور ایک ہاتھ سے

وہ جوان عورت کا ہاتھ پکڑے ہوئے لیجا رہی تھی۔ کہر کی نقاب چھائی ہوئی تھی اور ہر چیز ایک سایہ معلوم ہوتی تھی۔ جوان عورت کے پاس بھی ایک چھوٹا سا بنڈل تھا جسے وہ بہت احتیاط کے ساتھ چادر میں چھپائے ہوئے تھی۔

بوڑھی عورت نے دفعتاً بلند آواز سے کہا "میں تھک گئی ہوں۔ اب آگے نہیں جا سکتی! محل قریب آگیا ہے، تھوڑی دیر آرام کر لو، پھر چلیں گے۔ محل وہی ہے نا ـــــ "سفید سی برجی"!

لڑکی نے سر ہلا کر کہا "اچھا تو بیٹھ جاؤ"۔

قریب ہی ایک درخت کے نیچے دونوں عورتیں بیٹھ گئیں۔ بوڑھی عورت نے لڑکی سے کہا "بیٹی جب فاطمہ مجھے ملی تھی تو تمہارے متعلق یہ کہا تھا کہ تم محل کی عورت ہو، اور تمہارے پاس بہت روپیہ ہے تم آگرہ سے ہمارے گاؤں تک پیدل کیوں آئیں؟"

نابینا لڑکی نے اپنی بے بصر آنکھیں اُسکی طرف کر کے کہا "میں محل کی شہزادی نہیں ہوں! میں تو ایک غریب خادمہ تھی! میرے پاس جو کچھ بھی تھوڑا بہت روپیہ تھا وہ ختم ہو گیا"۔

"اوہ! تم خادمہ ہو! دیکھو فاطمہ کتنی جھوٹی عورت ہے! کمبخت! بیٹی تیری آنکھیں کیونکر ضائع ہو گئیں"۔ لڑکی کے لبوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ پیدا ہوئی اور اُس نے جواب دیا "میں نے یہ آنکھیں اپنے خداوند کے حضور میں نذر کر دی ہیں ـــــ" اور یہ کہکر رونے لگی۔

عورت نے تسلی دیکر کہا "بیٹی رو نہیں! صبر کر! خدا تیری مصیبت آسان کرے گا۔ بیٹی اس بنڈل میں کیا ہے؟ سونا یا چاندی؟"

"سونا! چاندی! ـــــ ان سب سے زیادہ قیمتی چیز! کیونکہ میں نے اسکے لئے اپنی زندگی قربان کی ہے۔ یہ بہت بیش قیمت چیز ہے"!

بوڑھی عورت نے دل میں کہا "سونا چاندی سے بھی زیادہ قیمتی! بیشک جواہرات ہونگے، اور محل سے چُرائے ہونگے"

چمپا بالکل تھک گئی تھی، اس لئے وہ درخت کے نیچے پڑ کر سو رہی۔ بوڑھی عورت بھی سو رہی، مگر وہ جلد اُٹھ بیٹھی۔ چمپا کو سوتے سوتے کئی گھنٹے ہو گئے تو بوڑھی عورت نے اسے جگایا اور کہا "بیٹی اب شام ہونے آئی چلو محل کی طرف چلیں، ورنہ چلتے چلتے رات ہو جائے گی"۔ چمپا یہ سُنکر اُٹھ بیٹھی اور کپڑے جھاڑ کر پھر چل پڑی۔ جب دونوں محل پر پہنچ گئے تو اس نے بوڑھی سے کہا کہ اس دربان کو ایک روپیہ دو اور اس سے کہو کہ ہمیں شہزادہ کے حرم میں لیچلے"۔

چمپا مرمریں زینہ پر سے ہوتی ہوئی اوپر چڑھی۔ اب اسکی بے بصری کوئی رکاوٹ پیدا نہ کرتی تھی کیونکہ اسکے تمام حواس نے اسکی مدد کرنی شروع کر دی تھی۔ وہ محل کے چپہ چپہ سے واقف تھی۔

چمپا کو اب وہ زمانہ یاد آرہا تھا، جب وہ پُرانے محل کے بیرونی غلام گردش میں کھڑی رہا کرتی تھی۔ شاید اب

بوڑھی بیگم گلابی باغ میں جا بیٹھی ہونگی، کیونکہ وہ اسی وقت جایا کرتی تھیں، چمپا یہ معلوم کرنے کے لئے بیتاب تھی کہ بڑھی پنا بھی زندہ ہے یا نہیں!

(۸)

چمپا اب ملاقاتی کمرہ کی سیڑھیوں پر چڑھ رہی تھی۔ اسکی زندگی کے صبر آزما لمحات قریب سے قریب تر ہو رہے تھے اسکے قدم آگے بڑھنے سے انکار کر رہے تھے، تمام جوش ختم ہو چکا تھا، وہ بہت کچھ کہنے آئی تھی، مگر اب ایک لفظ بھی اس کے دماغ میں نہ تھا۔

دربان چمپا کو وزیر کے حوالہ کر کے رخصت ہو گیا اور وزیر نے چمپا سے مخاطب ہو کر کہا "میرے ساتھ آؤ"۔ چمپا نے ہمت کر کے آگے قدم بڑھایا اس حال میں کہ اسکا قیمتی خزانہ سینہ سے لگا ہوا تھا۔

قدموں کے نیچے نرم قالین کے مس ہونے اور پھولوں کی خوشبو سے چمپا نے سمجھ لیا کہ وہ منزل مقصود پر پہنچ گئی ہے۔ وزیر نے جھک کر سلام کیا اور بآواز بلند کہا "جہاں پناہ! ایک بھکارن حضور کی قدمبوسی کرنا چاہتی ہے"۔ چمپا نے تمام حاضرین کی آنکھیں اپنی طرف مرکوز ہوتی ہوئی محسوس کیں۔ کیا کوئی اسے پہچان سکتا تھا؟ نہیں۔ کیونکہ وہ کبھی اس محل میں نہیں آئی تھی اور شہزادہ نے بھی اُسے صرف ایک بار سرسری طور پر دیکھا تھا۔

کوئی شخص قریب آیا۔ قدموں کی آہٹ وہ کبھی نہ بھول سکتی تھی اور نہ اسکی آواز اجنبی تھی جس نے یہ پوچھا کہ "تو کیا چاہتی ہے؟"

یہ الفاظ چمپا کے کانوں میں گونجے اور کئی دفعہ اس نے جواب دینے کی کوشش کی، مگر وفور شوق نے اُسے بولنے نہ دیا۔ پھر پوچھا گیا "تم یہاں کس لئے آئی ہو؟ کیا چاہتی ہو؟"

چمپا نے بہ مشکل تمام ایک گلوگیر آواز سے جواب دیا "میں مانگنے نہیں آئی ہوں۔ دینے آئی ہوں"۔ چمپا نے محسوس کیا کہ تمام محفل میں ایک حیرت و استعجاب کی لہر دوڑ گئی۔

شہزادہ نے ایک طنزیہ قہقہہ لگایا اور کہا "ہاں! بیشک، وہ کیا ہے؟"

چمپا نے اپنی زندگی کا سرمایہ ——— وہ خزانہ جسکی کوئی قیمت نہ تھی اور جسے اُسنے اپنی آنکھیں قربان کر کے تیار کیا تھا ——— آگے بڑھایا اور شہزادہ کو دیا۔ شہزادہ نے مضطربانہ انداز سے اسے لیلیا۔

چمپا کے پاؤں لڑکھڑائے اور وہ قالین پر ہانپتی ہوئی بیٹھ گئی۔ سینہ بلیوں اُچھل رہا تھا اور اُسکے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔

کہ دفعتاً بنڈل کے اوپر سے غلاف کے کھلنے کی آواز آئی اور اب چمپا نے سمجھا کہ ——— اسکی زندگی کا راز کھلنے والا تھا!

دفعتاً ایک قہقہہ کی آواز فضا میں گونجی! چمپا سرد پڑ گئی! اسکا جسم ایک سنگین مجسمہ بنگیا! کیا اسکی تمام زندگی کے سرمایہ کی یہی قیمت تھی! ایک طنزیہ قہقہہ! آہ! اس قہقہہ کا کیا مطلب تھا؟

ایک آواز سنائی دی۔ "کیا یہ عورت دیوانی ہو گئی ہے! دیکھو کیسی گستاخ ہے! شہزادہ کے حضور میں چند چیتھڑے پیش کرنے لائی ہے"۔

"چیتھڑے"! وہ کیا سُن رہی تھی اسکا دماغ چکرا رہا تھا!

چمپا ایک ہچکی کے بعد شہزادہ کے قدموں میں گر پڑی، وہ اندرونی نور جس نے اسوقت تک نابینا لڑکی کو منور کر رکھا تھا آج ہمیشہ کے لئے جھلملا کر ختم ہو گیا۔

شہزادہ نے برافروختہ ہو کر کہا "اس بدبخت و گستاخ لڑکی کو یہاں سے نکالدو، اس نے میری محفل کو مکدر کر دیا۔ لیجاؤ ابھی میرے سامنے سے ہٹاؤ اگر یہ مر گئی ہو"!

شہزادہ کی ایک محبوبہ بولی "بھلا اس لڑکی کو یہاں کیوں لایا گیا تھا؟ آج صبح ہی آگرہ کی ایک بڑھیا نے زردوزی کا ایک شاہکار پیش کیا تھا، شہزادہ اُسے دیکھکر کتنا خوش ہوا تھا اور بڑھیا کو کتنا انعام دیا! شاید یہ بھی اسی لالچ میں آئی تھی۔ ہم سمجھے تھے جسطرح صبح ایک عمدہ تحفہ حاصل ہوا تھا، شام کو بھی ایسا ہی ملے گا، مگر نہیں یہ لڑکی مذاق کر رہی تھی! اور بیوقوف بنانے آئی تھی"!

سارا مجمع چمپا کے بیحس جسم پر حقارت آمیز نظریں ڈالتا ہوا باہر نکل گیا۔ مقابل کی دیوار پر ایک زردوز مجسمہ لٹک رہا تھا، جسکی دو خوبصورت آنکھیں — جنہیں زندہ کرنے کے لئے چمپا نے اپنی بصارت کی قربانی کی تھی — اُسکے بیحس جسم اور آنکھوں کے گمشدہ نور کی طرف دیکھ رہی تھیں!

(ماخوذ)

ظفر قریشی دہلوی

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ جسمیں پاکیزگی بیان سلوب ادا، ندرت خیال اور جدت اظہار کے ایسے ایسے نادر نمونے موجود ہیں کہ کسی دوسری تصنیف میں نہیں مل سکتے حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اسکے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں قیمت علاوہ محصول دس آنے (۱۰/)

فراست الید

مولٰنا نیاز فتحپوری جسکے مطالعہ سے ایک شخص باسانی ہاتھ کی شناخت اور اُسکی لکیر و نکو دیکھکر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل، سیرت عروج و زوال، موت و حیات صحت و بیماری، شہرت و نیکنامی وغیرہ کے متعلق صحیح طور سے پیشینگوئی کرسکتا ہے قیمت علاوہ محصولڈاک (عہ)

مینجر نگار بک ایجینسی لکھنؤ

دُنیا کو مذہب کی ضرورت ہے یا نہیں

اگر ہے تو وہ مذہب کون ہو سکتا ہے

میں نے جولائی کے ملاحظات میں رسالۂ قیام الدین پر تبصرہ کرتے ہوئے وعدہ کیا تھا کہ اگست کے ملاحظات میں اس حقیقت سے بحث کرونگا کہ وہ یاجوجی قوت کونسی ہے جو اس مذہب کو برباد کرنا چاہتی ہے اور میں نے اگست کے ملاحظات میں اس مسئلہ کو چھیڑا بھی تھا، لیکن چونکہ یہ بحث بہت زیادہ وسعتِ بیان کی طلبگار تھی، اسلئے تمہید ہی تمہید میں ملاحظات کے صفحات ختم ہو گئے، بہرحال اب وعدہ کے مطابق میں ایک مستقل مضمون کی صورت میں اس مسئلہ کو شروع کرتا ہوں۔

جیسا کہ میں پہلے بھی ظاہر کر چکا ہوں اس مضمون کے تین حصے ہونگے، پہلا وہ جس میں مذاہب عالم کی ابتداء اور اُن کے مدارج و معتقدات سے بحث ہوگی، دوسرے حصہ میں اُن اسباب و حالات کا ذکر ہوگا، جنھوں نے مذہب کی طرف سے انسان کو باغی بنایا اور تیسرے حصہ میں مستقبل کے مذہب یا مذہب کے مستقبل کا ذکر ہوگا آج کی اشاعت میں حصہ اول کی ابتدا کرتا ہوں اور چونکہ یہ بحث ذرا طویل ہے، اسلئے ممکن ہے اس ماہ میں ختم نہ ہو سکے۔ باقی دو حصے غالباً اتنے طویل نہ ہونگے اور اسطرح گویا زیادہ سے زیادہ نومبر ۳۲ء تک اس بحث کا پورا ہو جانا یقینی ہے۔

نیاز

طبقات الارض و فلکیات کے ماہرین کا قول ہے کہ دنیا کروڑوں برس کی عمر رکھتی ہے، یعنی اُسکی موجودہ حالت کروڑوں برس کے تدریجی ارتقاء اور تغیر و تبدل کے بعد قائم ہوئی ہے، ہر چند یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ انسان کا وجود روئے زمین پر کب سے پایا جاتا ہے، لیکن بعض ماہرین علم الاقوام کا خیال ہے کہ کم از کم پچاس لاکھ سال ہوئے جب اول اول انسان کا ظہور ہوا، اور غالباً اُسی وقت سے مذہب کا بھی وجود پایا جاتا ہے، ہر چند انسان نے اپنے خیالات و تجربات کو تحریر میں لانا صرف پانچ چھ ہزار سال سے شروع کیا ہے، اور قدیم زمانہ کی جو روایات اُس نے قلمبند کی ہیں وہ خرافیات کی حد سے آگے نہیں بڑھتیں، لیکن انسان کی حالت دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف اقوام و ملل کی رفتارِ میں ان ارتقاء میں یکساں نہیں

رہی اور ماحول کا اثر اس پر برابر پڑتا رہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض قومیں مدارج ارتقاء طے کر کے جلد معراج ترقی تک پہونچ گئیں اور بعض قومیں ابھی تک ظلمت و تاریکی کے دور میں زندگی بسر کر رہی ہیں۔ بہر حال ہمیں اقوام عالم کی صحیح تاریخ کا علم ہو یا نہ ہو لیکن فطرت انسانی کو دیکھتے ہوئے یہ حکم آسانی سے لگایا جا سکتا ہے کہ مذہب انسان کی زندگی کے ساتھ پیدا ہوا اور ہمیشہ اسکے ساتھ رہیگا، لیکن زمانہ و ماحول کے لحاظ سے جو اثر اس پر ہوتا ہے اُسکے لحاظ سے اس میں تبدیلیاں بھی ہوئیں، اور ہمیشہ ہوتی رہیں گی۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ انسان کا مذہب ابتداء میں کیا تھا اور رفتہ رفتہ کیا ہو گیا۔ اس مقصد کیلئے ہم اقوام عالم کی دو تقسیمیں کرتے ہیں، ایک وہ جو مدارج ارتقاء طے کرتے کرتے متمدن و مہذب ہو گئیں، دوسری وہ جو ہنوز غیر متمدن اور وحشی ہیں۔

مدارج ارتقاء

جب ذہن انسانی کا ابتدائی دور ختم ہوا اور اُس میں سوچنے کی کیفیت پیدا ہوئی تو سب سے پہلی اسکی توجہ اپنے جسم کے سایہ کی طرف منعطف ہوئی اور عدم پختگی عقل کی وجہ سے اس نے اس سایہ کو خود اپنا ہی ایک جزو یا "زندہ شئی" سمجھا، اسی کے ساتھ اس کے خیال میں یہ بھی آیا کہ جب وہ سوتا ہے تو شاید یہ اُس کا سایہ ہی ہے جو دنیا بھر کی سیر کرتا ہے، اور رات کو جب چاروں طرف تاریکی چھا جاتی ہے، تو شاید یہ روحیں ہیں جن سے سائیں سائیں کی آواز آتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ان روحوں کی صفات کا خیال بھی دل میں پیدا ہوا، اور موذی ارواحوں سے خوف و دہشت اور شفیق روحوں سے محبت کا اظہار کرنے لگا اور یہ تھی اولیں بنیاد مذہب کی۔

پرستش

ابتدائے آفرینش میں انسان بحالت اشتراکیت رہا کرتا تھا، اور دنیا کی کوئی چیز کسی شخص خاص کی ملکیت نہ سمجھی جاتی تھی، سب ملکر شکار کرتے تھے اور سب ساتھ ملکر کھاتے تھے، لیکن ہمیشہ یہ حالت قائم نہیں رہی اور بعد کو طاقتور نے کمزور کو دبانا شروع کیا۔ اور "ادارہ حقوق و ملکیت" قائم ہو کر رفتہ رفتہ سردار، راجہ، و فرمانروا کا وجود عمل میں آیا۔ لیکن سرداری یا فرمانروائی صرف اسی دنیا تک محدود نہیں سمجھی گئی بلکہ اُس کے مرجانے پر بھی وہی احترام قائم رہا اور اُسے دیوتا سمجھنے لگی یعنی اس طرح دنیا میں زندہ بادشاہ کی فرمانبرداری اور مردہ بادشاہ کی پرستاری کا سلسلہ جاری ہو گیا جسے "عُبادت و پرستش" کی ابتداء کہنا چاہئیے۔

بہشت و دوزخ

اس کے بعد انسان کے دل میں یہ سوال پیدا ہوا کہ مرنے کے بعد انسان کی روح کہاں جاتی ہے؟ پہلے تو یہ خیال ہوا کہ وہ تاریک جنگلوں میں یا نظروں سے دور کسی مقام میں رہتی ہے، لیکن جب جنگلوں میں چلنے پھرنے سے کبھی کسی روح سے ملاقات نہ ہوئی تو یہ خیال ہوا کہ وہ یا تو برفپوش پہاڑوں پر رہتی ہے، یا زمین کے نیچے کسی مقام پر چلی جاتی ہے اور یہیں سے سورگ و پاتال، بہشت و دوزخ، علیین و سجیین وغیرہ کی روایات پیدا ہوئیں۔

مقتدایان دین

ارتقاء تمدن کے ساتھ ساتھ جب انسان نے خانہ بدوشی چھوڑ کر ایک مستقل جگہ اقامت اختیار کی اور زراعت و فلاحت میں مصروف ہو گیا تو اُس نے اپنے مختلف اغراض و مشاغل کے لحاظ سے مختلف

دیوتا بنالے - انسان قدیم سمجھتا تھا کہ اسکی صحت و بیماری، زراعت و شکار، اور تمام مقاصد کی کامیابی و ناکامی کا انحصار انھیں دیوتاؤں کی خوشنودی یا برہمی پر ہے اور اسی لئے وہ پوجا پاٹ یا پرستش و نمایش کو بہت اہمیت دینے لگا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ دیوتا بھی انسان کی طرح الحاح وزاری سے خوش ہوتے ہیں، اور اگر خوشامد نہ کیجائے تو برہم ہوجاتے ہیں - چنانچہ پرستش کے خاص مراسم قائم ہوئے، اور جن لوگوں نے ان مراسم کے ادا کرنے میں مہارت حاصل کی، ان سے لوگ اپنی عبادت میں مشورہ لینے لگے، اور اُن کی خدمات کے بدلے میں کچھ نذرانہ بھی دیا جانے لگا - اسطرح پنڈتوں - پجاریوں - ملاؤں - دستوروں - موبدوں، بھکشوؤں - پادریوں وغیرہ کی ابتدا ہوئی -

مگر چونکہ درحقیقت اغراض و مقاصد میں کامیابی کا انحصار بھوتوں یا ارواح کی مدد پر نہیں ہے، اسلئے جب کبھی عبادت کرنے کے بعد بھی کسی شخص کا مقصد حاصل نہ ہوتا تھا تو وہ اپنے پجاری یا مقتدائے دین سے شکایت کرتا تھا، اور وہ اپنا اعتبار و اعتماد قائم رکھنے کیلئے اِدھر اُدھر کی باتیں بنا کر ناکامی کی توجیہ کرنا شروع کر دیتا تھا، یہ تھی ابتدا اُس جھوٹ کی جو سب سے پہلے ارباب مذہب کی طرف سے بولا گیا، اور جس نے آگے چلکر تمام دنیا کو مکر و فریب میں مبتلا کر دیا -

بُت پرستی ارتقاء تمدن کے ساتھ انسان کے خیالات میں بھی ترقی ہوئی - وہ دنیا کی چیزوں کو دیکھتا اور اُن پر غور کرتا تھا - وہ سمجھنا چاہتا تھا کہ طوفان کیوں آتا ہے؟ آگ کیوں بھڑکتی ہے؟ دریا کیوں بہتا ہے؟ بادل کیوں گرجتا ہے؟ بارش کیوں ہوتی ہے؟ شیر و نہنگ اسقدر طاقتور و موذی کیوں ہیں؟ نباتات ہر سال از سر نو کیوں پیدا ہوتے ہیں؟ ان سوالات کا جواب اس کے ذہن کی طرف سے یہ ملتا تھا کہ یہ سب ارواح کے کرشمے ہیں - چنانچہ ہر بات کے لئے ایک بُت قائم کر دیا گیا اور پوجا ہونے لگی -

قاعدہ ہے کہ چھوٹی بات سے بڑی بات پیدا ہوتی ہے، جب چھوٹی چھوٹی ارواح کا خیال آیا تو اُسکے بعد قدرت کی بڑی بڑی باتوں کا خیال آنا ضرور تھا - اس لئے سورج، چاند، ستارے، آسمان، زمین، بارش، بجلی، رعد وغیرہ کو بڑے بڑے دیوتاؤں سے منسوب کر کے اُن کے ہیکل قائم کئے گئے اور اسطرح دنیا میں بت پرستی کی ابتدا ہوئی -

توحید جس طرح ایک قبیلہ دوسرے کو مغلوب کر کے طاقتور ہوجاتا تھا، اسی طرح بعد کو جب ایک بادشاہ نے دوسرے فرمانرواؤں کو مغلوب کر کے اپنا تابع بنالیا اور شہنشاہ ہوگیا تو انسان کا خیال دنیائے پرستش میں بھی اسی اُصول پر کاربند ہوا، اور اُسنے سمجھا کہ دیوتاؤں میں بھی کسی ایک دیوتا کو سب پر غالب آنا چاہئیے، اور اسطرح سب سے پہلے توحید کی بنیاد انسان کے دل میں پڑی -

الحاد لیکن انسان کے دماغ کو قرار نہیں - جوں جوں عقل میں پختگی آتی گئی خیالات میں بھی وسعت پیدا ہونے لگی - تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ قصبوں اور شہروں کی بنیاد پڑی، کتابیں لکھی جانے لگیں - وسعت خیالات کے ساتھ عقائد پر مناظرے شروع ہوگئے، جن اُمور کا منصرم بتوں یا دیوتاؤں کو سمجھا جاتا تھا، اُن کے اسباب و علل کچھ اور نکل آئے - کیس

گیس کا کرشمہ نظر آیا۔ کہیں برق و بخار کا عمل اور اسیطرح تمام حوادث قدرت کی توجیہیں ہونے لگیں، یہ تھا پہلا صدمہ جو مذہب کو اب سے دو تین ہزار سال قبل پہونچا اور جب دنیا الحاد سے تعبیر کرنے لگی۔

مذاہب الاخلاق

یہ حال اُن مذاہب کا تھا جنھیں "مذاہب فطرۃ" (Nature Religions) کہتے ہیں لیکن بالکل اسی طرح سے ابتدا و ارتقاء اُن مذاہب کی بھی ہوئی ہے، جنھیں "مذاہب اخلاقی" (Ethical Religions) کہتے ہیں۔ اسمیں کلام نہیں کہ مقتدایان مذہب اول اول اسی پر زور دیتے رہے کہ دیوتاؤں کی پوجا کرو، بھینٹ چڑھاؤ، قربانیاں کرو اور پجاریوں سے مدد لیکر ان کو نذر دو، لیکن جب رفتہ رفتہ انہیں تعلیم بڑھی تو انھوں نے انسان کی اعلیٰ زندگی پر بھی اقتدار قائم کر دیا، اور معیشت و معاشرت کے آئین و قوانین بنا کر انھیں دیوتاؤں سے منسوب کیا یہ تھی بنیاد مذہب اخلاق کی۔

کتب مقدسہ

اول اول پوجا پاٹ کی رسمیں بطور اسرار سینہ بسینہ چلی آرہی تھیں، لیکن جب بعد کو انسان نے حروف ایجاد کئے اور وہ لکھنے پڑھنے لگا تو مقتدایانِ دین نے ان ابتدائی اعتقادات اور قدیم رسموں کو مدون کرنا شروع کیا۔ چونکہ حافظہ زیادہ کام نہیں دے سکتا تھا، اس لئے اُنھوں نے سُنی سُنائی باتوں سے ان کتابوں کو بھر دیا لیکن اُسی کے ساتھ اپنی قوم کی عظمت و شان بھی بیان کی۔ پُرانے بادشاہوں اور قوموں کے کچھ قصے بھی داخل کئے، اپنے معبود کو تمام معبودان عالم سے غالب قرار دیا۔ اور اپنی قوم کو خیر الامم ظاہر کیا۔ اُنھوں نے یہ بھی ظاہر کیا کہ اُن کا مذہب ابتدائے آفرینش سے اسیطرح چلا آتا ہے۔ اور ہر جگہ اپنے خدا کی بزرگی اور جلال کا اظہار کیا۔

اب چونکہ احیاء علوم و فنون کا زمانہ ہے۔ تمام باتیں سائنس کی روشنی میں دیکھی جاتی ہیں۔ اس لئے ماہرینِ فن نے "علم معیار المذاہب" اور "علم تقابل المذاہب" بھی ایجاد کیا ہے جس سے مختلف مذاہب کو بالمقابل رکھکر جانچا جا سکتا ہے علاوہ ازیں ماہرین آثار قدیمہ نے تمدن قدیم کے وہ تمام خزائن برآمد کر لئے ہیں۔ جن کے ذریعہ سے کتب مقدسہ کے بیانات کی بخوبی جانچ کی جا سکتی ہے۔

قدیم مذاہب دراصل مظاہر قدرت کے متعلق جاہل اقوام و ملل کی سیدھی سادی خیال آرائی سے زیادہ کوئی چیز نہ تھے۔ لیکن جب بعد کو ان میں کچھ علمی تاویلیں اور اخلاقی اُصول شامل ہو گئے۔ تو مقتدایان دین یہ دعوی کر بیٹھے کہ ان کا مذہب "الہامی" ہے۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ ہر مذہب، دوسرے کا مضحکہ اُڑانے لگا۔ کیونکہ مذہب کا صحیح علم صرف طبقۂ علماء تک محدود رہا۔ اور عوام کو اس پر غور کرنے کی اجازت نہیں ملی۔ تاہم تقابل مذاہب سے ہم کو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض مذاہب دوسروں سے نسبتاً اعلیٰ ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جو مذہب سب سے آخر میں ظاہر ہوا ہو گا وہ سب سے بہتر ہو گا۔

مذاہب تاریخی

موجودہ تہذیب و تمدن کا آغاز اب سے پانچ چھ ہزار سال پیشتر ہوا۔ لیکن ایک جگہ نہیں بلکہ اسکی ابتدا کئی جگہ سے ہوئی۔ سب سے پہلے تمدن کی ابتدا کریٹ۔ مصر اور عراق میں ہوئی۔ یہ تینوں ملک قریب قریب واقع ہیں۔ اور اب سے پانچ چھ ہزار سال قبل سرزمین کریٹ علیحدہ جزیرہ نہیں تھی۔ بلکہ مغربی ایشیا کا ایک حصّہ تھی۔ الغرض ان تینوں ملکوں نے اپنا اپنا تمدن تقریباً ایک ہی ساتھ شروع کیا۔ اور رفتہ رفتہ اسقدر ترقی کی کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار تصویروں کے ذریعہ سے کرنے لگے۔ جسے "خط صوری" کہتے ہیں۔

کریٹ

کریٹ (Crete) کا تمدن بھی اسیقدر اعلیٰ تھا، جیسا ملک مصر کا۔ اور ہرچند ابھی تک وہاں کی قدیم زبان پر عبور حاصل نہیں ہوا۔ لیکن وہاں کے آثار قدیمہ سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ وہاں کوئی "مذکر دیوتا" نہیں تھا۔ صرف ایک "دیوی" کی پرستش ہوتی تھی۔ اور اس دیوی کی چھاتیاں بہت بڑی بڑی بنائی جاتی تھیں۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دیوی دراصل "دھرتی ماتا" تھی۔ گویا اہل کریٹ کا مذہب اس درجہ سے آگے نہیں بڑھا تھا، جب صرف مظاہر قدرت کی پرستش کی جاتی ہے۔

مصر

اہل کریٹ ہی کی جنوبی شاخ مصر قدیم کا مذہب معلوم ہوتا ہے۔ ہرچند دونوں کے معتقدات مذہب اور مذہبی رسوم میں بہت فرق پایا جاتا ہے۔ یعنی اگر کریٹ میں صرف ایک "دیوی" تھی تو مصر میں دیوتاؤں اور دیویوں کی خاصی فوج موجود تھی۔ اور ان دیوتاؤں اور دیویوں کے پجاری بھی مختلف تھے۔ ان لوگوں میں حیات عقبیٰ کا وہی عقیدہ موجود تھا جو آج کل مسیحیت یا اسلام میں نظر آتا ہے۔ ان لوگوں کا عقیدہ یہ تھا کہ جب انسان مرجاتا ہے تو اُس کا "ہمزاد" حنوط شدہ لاش کے ساتھ قبر میں رہتا ہے۔ اور اُس کی روح جزاو سزا کے لئے خداوند اوسیرس (Osiris) کے پاس چلی جاتی ہے۔ جو عالم ارواح کا بادشاہ ہے۔ اگر اس روح کی بداعمالیاں نیکیوں سے زیادہ ہوتی ہیں تو وہ روح تباہ یا فنا کردی جاتی ہے۔ اگر روح کی نیکیاں اس کی بداعمالیوں سے زیادہ ہیں تو اسے "مسرت ابدی" کی حالت بخش دیجاتی ہے۔

مصری مذہب کے متعلق سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس میں جانور کا سا سر رکھنے والے دیوتاؤں کی بڑی تعداد موجود ہے۔ حالانکہ جس قوم کا تمدن اسقدر اعلےٰ رہا ہو اُسکو ایسے عجیب الخلقت خداؤں کے سامنے سر جھکانے سے احتراز کرنا چاہیئے۔ لیکن مطالعہ "مصریات" سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم مصر کا صرف طبقۂ جہلا ایسے دیوتاؤں کا معتقد تھا اور تعلیم یافتہ طبقہ اُن دیوتاؤں کی پرستش نہیں کرتا تھا۔ پجاریوں کے مختلف طبقات نے اپنے اپنے مختلف دیوتا بنا لئے تھے۔ جن پر وہ آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ علاوہ اسکے اس کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وادی "النیل" میں مختلف قومیں مختلف ممالک سے آکر آباد ہوئی تھیں۔ اور اسی لئے ان دیوتاؤں کو مختلف ہونا چاہیئے تھا۔ کسی قوم کا خدا سورج تھا، کسی کا چاند، کسی کا عقاب، کسی کا گھڑیال، کسی کا بیل

اور کسی کا بندہ[1]۔ ان مختلف دیوتاؤں کے پجاری مدتوں تک خانہ جنگی کراتے رہے اور آخرکار صدیوں کی لڑائی کے بعد مسیح سے چودہ سو برس قبل ان تمام اقوام کو ایک بادشاہ نے فتح کر کے انھیں پوری طرح منظم کیا اور ایک قوم بنا دیا۔ یہ بادشاہ امان حاطب رابع (Amen Hotep IV) تھا۔ اس بادشاہ نے نہ صرف یہ کیا کہ مصریوں کو ایک قوم بنا دیا۔ بلکہ ملک میں ایک خالص روحانی مذہب بھی قائم کیا جو بڑی حد تک توحید کا درس دیتا تھا۔

بابل

اب سے تقریباً پانچ چھ ہزار سال قبل وادی فرات کے مختلف علاقوں میں طوائف الملوکی قائم تھی۔ جگہ جگہ بہت سے آزاد شہر آباد تھے۔ اور ہر شہر ایک جداگانہ خودمختار ریاست تھا۔ جس میں حکومت مقتدایان دین کی تھی۔ اگرچہ بابل کی تاریخ بہت طویل ہے لیکن اسیقدر بتا دینا کافی ہوگا کہ تمام ملک میں دو قومیں پورے اختلاط وارتباط کے ساتھ بستی تھیں۔ اُن میں ایک قوم سامری (Samerians) اور دوسری سامی یا سامیتی (Semitice) تھی۔ دونوں قومیں شیر و شکر کی طرح ملی ہوئی تھیں حتیٰ کہ دونوں قوموں نے اپنے اپنے معبود بھی شامل کر لئے تھے۔ یہ لوگ کبھی "حیوان پیکر" دیوتا کے پرستار نہیں تھے۔ لیکن جب کامیاب پجاریوں نے اپنے دیوتاؤں کی عظمت و جلال کو فروغ دیا تو بہت سے چھوٹے چھوٹے دیوتا بن گئے۔ سامریوں کے دیوتاؤں میں بڑے بڑے دیوتا سنو و بعل (Snu AND BAAL) خدائے آسمان) ایا (EA) دہرتی ماتا) سن (SIN) چندرمان) نوسکو (NUSKU) اگنی) وغیرہ تھے۔ اور سامیوں کے بڑے دیوتا اور دیویاں یہ تھیں:۔ شمس (SHAMSH) سورج) مردوق (MARDUK) سورج) اشتار (Ishtar) عشق و محبت اور جنگ و جدال کی دیوی) تموز (SHAMMUZ) افزائش نسل و فصل کا دیوتا)

جب یہ تمام ریاستیں ملکر سلطنت بابل قائم ہوئی، اُسوقت بھی مقتدایان دین کی خصومت بدستور پائی جاتی تھی۔ لیکن نہ اسقدر اور آخرکار وہاں کا مقامی خدا مردوق سب سے بڑا خدا بن بیٹھا، جس کے بعد شمس کا دور دورہ ہوا۔

الغرض ارتقاء تمدن کے ساتھ تہذیب معتقدات کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ اور دیوتاؤں کی شخصیت میں زیادہ تجرید اور روحانیت پیدا ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ اشتار جو پہلے فسق و فجور کی دیوی تھی اور جس کے بھون میں" مقدس حرامکاری" ہوا کرتی تھی وہی درماندگان معصیت کی جائے پناہ اور زاہدان مرتاض کی سرپرست بن گئی۔

چین

یہ امر باور کرنے کے وجوہ موجود ہیں کہ ملک چین کی قدیم تہذیب و تمدن کا ابتدائی سرچشمہ مغربی ایشیا تھا۔ اسی لئے قدیم چین کا تمدن، بابل کے تمدن سے ملتا جلتا تھا۔ ہر چند چینیوں کا دعویٰ یہ ہے کہ اون کا تمدن کم از کم بیس[20] ہزار

---

[1] بعض قدیم مصری دیوتاؤں کے نام یہ ہیں:۔ **اوسیریز** (Osiris) "ملک یوم الدین") **رع** (Ra) "سورج") **ہورس** (Horus) نجات دہندہ) **آسیز** (Isis) افزائش نسل زراعت کی دیوی) **نیت** (Neith) دولت و خوشحالی کی دیوی) **آتور** (Athor) گاؤ سر دیبی یا دہرتی ماتا) **آنوبیس** (Anubis) سگ سر دیوتا۔ محافظ قبرستان)

سال کا ہے۔ لیکن محققین کا خیال ہے کہ اسکی عمر پانچ چھ ہزار سال سے زیادہ کی نہیں ہے۔

قدیم چین کے مذہب کا حال اُن مغول قبائل کے معتقدات و رسوم سے معلوم ہو سکتا ہے۔ جو حدود چین کے اندر یا اُن کے متصل آباد تھے۔ یہ قومیں چکچی۔ یوقاغیر۔ قرباق اور رانیو تھیں۔ چکچیوں کے نزدیک درخت، جنگل، جھیل، دریا وغیرہ ہر چیز کا ایک دیوتا تھا۔ جسے ان کی اصطلاح میں "آقا یا مالک" کہتے تھے۔ مرجانیوالوں کی روحیں سعید ہوں یا خبیث زندہ سمجھی جاتی تھیں خبیث ارواح کے متعلق یہ عقیدہ تھا کہ ویہات و ریگستان میں رہتی ہیں۔ اور لوگوں کو ستاتی ہیں، انھیں وہ لوگ شیاطین کہتے تھے چونکہ یہ ارواح خبثیہ لوگوں کو بہت ستاتی تھیں، اس لئے جھاڑ پھونک والوں کی بھی کثیر تعداد موجود تھی۔ جنھیں وہ لوگ "دشمن" کہتے تھے۔

انہیں ایک بڑا دیوتا بھی تھا، جسے وہ اپنی زبان میں "جان بخش (آفریدگار)" کہتے تھے۔ لیکن تعجب یہ ہے کہ وہ اس کی عبادت نہیں کرتے تھے (ہندوؤں میں بھی "آفرینندہ" دیوتا برہما ہے۔ لیکن اسکی پرستش نہیں ہوتی) یوقاغیروں اور قرباقوں میں بھی ایک آسمانی خدا تھا، اور ان لوگوں کا یہ عقیدہ تھا کہ اگر اُس کے حضور میں جانوروں کی قربانی دینے میں کوتاہی کیجاتی ہے تو وہ ناراض ہو کر سو جاتا ہے اور پھر دنیا میں "فساد" پیدا ہو جاتا ہے۔ الغرض یہ تھی ابتدائی حالت چین کے معتقدات کی۔

قدیم چینیوں کے مذہب میں بھی عام دیوتاؤں پر ایک "مہادیو" تھا جسے وہ لوگ "شنگتی" (اعلیٰ آسمانی بادشاہ) یا "تین" (آسمان) کہتے تھے جو سب سے بلند مرتبہ کا معبود خیال کیا جاتا تھا، الغرض یہاں مسیح کی پیدائش سے تین ہزار سال قبل ایک "آسمانی خدا" کا عقیدہ ضرور موجود تھا، اگرچہ طبقہ عوام و جہلا میں چھوٹے چھوٹے دیوتاؤں کی بھی پرستش ہوتی تھی۔

چھٹی صدی قبل مسیح میں دولت چین پر ادبار و زوال کی گھٹائیں چھائیں۔ عالم فساد طاری ہو گیا۔ اسوقت ملک میں دو شخص ایسے پیدا ہوئے جنھوں نے ملک کو ظلمت و جہالت سے نکالنا چاہا ایک کا نام لاؤشہ (Laotse) تھا اور دوسرے کا نام کانگفوشہ (Confucius = Kong Fu Tse = کنفوش)، یہ دونوں "لاادریت" (Agnosticism) کے قائل تھے اور اُن کے اثر سے تعلیم یافتہ چین اب سے اڑھائی ہزار سال پیشتر درجۂ "لاادریت" کو پہونچ گیا تھا۔ لاؤشہ نے جسے فارسی زبان میں "لوشا" کہتے ہیں مذہب "تاؤیت" (Taoism) قائم کیا (لفظ تاؤ کے معنی چینی زبان میں صراط مستقیم کے ہیں)، لیکن بعد میں یہ مذہب "بودیت" (Budhism) سے ملکر مجموعۂ اوہام ہو گیا۔

حکیم کنفوشا کی تعلیم بھی لاادریت پر مبنی ہے، اور اُسکا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کا فرض ہے کہ روحانی ہستیوں کا احترام کرتے ہوئے ان فرائض کو صحیح طور پر ادا کرے جو اس پر از روئے حقوق العباد عائد ہوتے ہیں۔ روحانیات میں مبتلا ہونا مناسب نہیں۔ یہ مذہب صرف مجموعۂ ضوابط اخلاق ہے۔ جس پر اڑھائی ہزار برس سے چین کا روشن خیال طبقہ عامل ہے۔

جاپان جاپان کے تمدن و شائستگی میں چین کا اسقدر حصہ ہے کہ جاپان کو اس سے علیحدہ کرنا فضول ہے۔ جاپان میں عوام کا مذہب شنتوئیت (Shintoism) ہے جو چین کے مذہب تاؤئیت کا مترادف ہے۔ علاوہ ازیں چین کی

طرح جاپان میں بھی بودیت کے رو اسم داخل مذہب ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ مذہب شنتو میں ۸۰ لاکھ دیوتا ہیں۔ بودیت کی طرح مذہب کنفوشا بھی جاپان میں چین سے آیا۔ اور قرنہا قرن سے تعلیم یافتہ جاپانی اسی مذہب کے اُصول پر عامل ہیں۔

مذاہب الہند

مشہور ہے کہ براعظم ہند میں جتنی زبانیں بولی جاتی ہیں وہاں اتنے ہی مذاہب بھی رائج ہیں۔ ایک طرف کوہستان نیل گڈھی کے نیم وحشی ٹوڈے ہیں جو ارواح یا دیوتاؤں کے معتقد ہیں۔ دوسری طرف آریا ہیں جو خود کو خدا پرست کہتے ہیں۔ ایک طرف وشنوئی ہیں جو رام اور کرشن اور وشنو کے اوتاروں کو مانتے ہیں۔ دوسری طرف شیو مت والے ہیں جو "لنگ اور یونی" یا "مہادیو اور پاربتی" کی پرستش میں اپنی فلاح و نجات سمجھتے ہیں۔ سنسکرت کی قدیم ادبیات اور مغربی ایشیا کے آثار قدیمہ سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان کی آریا قوم کا تعلق قدیم اقوام فرنگ سے عموماً اور ایرانیوں سے خصوصاً بہت زیادہ تھا۔ اب سے تین ہزار تین سو برس قبل جب اہل میڈیا (MEDIAUS) کو اپنی پڑوسی مغربی سلطنت سے شکست حاصل ہوئی تو ایک صلحنامہ لکھا گیا جسے ماہرین آثار قدیمہ نے برآمد کر لیا ہے۔ اس معاہدہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل میڈیا نے ایسے دیوتاؤں کو ضامن ٹھہرا کر دستخط کئے ہیں جو قدیم آریوں کے دیوتا تھے، مثلاً اندر۔ ورون۔ اگنی وغیرہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اہل میڈیا اور قدیم آریا قوم کا ایک ہی مذہب تھا۔ اور یہی مذہب قدیم ایرانیوں کا رہا ہوگا۔

آریا قوم یا قدیم ہندوؤں کے مذہب کا حال "ویدوں" سے معلوم ہوتا ہے لیکن کتب یہود کی طرح ان میں بھی مدارج ارتقا پر پردہ ڈالدیا گیا ہے۔ درحقیقت یہ قوم "گوپال" (مویشی پالنے والی) خانہ بدوش قوم تھی۔ لیکن ویدوں میں جو حالات اس قوم کے بتائے گئے ہیں، ان میں ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ قوم دماغی لحاظ سے بہت ترقی یافتہ تھی۔ بہر حال محققین اور مستشرقین کی کاوش سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ قدیم ایرانیوں۔ یونانیوں۔ رومیوں۔ سلافیوں۔ توتانیوں (یعنی جرمن) کلٹون (CETS) اور آریاؤں کے مذاہب باہمدگر بہت متشابہ تھے۔

آریوں کی آمد سے قبل ہندوستان میں اور قومیں بھی آباد تھیں جنھیں آج کل کے علماء "دراوڑی اقوام" (Dravidian) کہتے ہیں۔ یہ لوگ جب زرخیز میدانوں سے نکال دئے گئے تو دور اُفتادہ کوہستانوں اور وادیوں میں جانب جنوب آباد ہو گئے۔ ان لوگوں کا مذہب اب بھی صرف مظاہر قدرت کے دیوتاؤں کی پرستش ہے مشرقی ہند کی کھاسی قوم (Khasia) کا بھی یہی مذہب ہے۔ اور یہی حال زمانہ قدیم میں تمام ممالک و اقوام کا تھا یعنی وہ معبودان فطرۃ (NATURE gods) کے پرستار تھے۔

آریا قوم اپنے ساتھ دوسرے دیوتا لائی جو صفات میں قدیم دیوتاؤں سے افضل تھے۔ یہ دیوتا تین اقسام پر مشتمل ہیں۔

آسمانی دیوتاؤں میں سب سے زیادہ اہم سوریہ یا سورج نارائن (یہی بابلیوں اور سامیوں کا شمسائیل تھا) اُشاس دیوی (صبح۔ یہ سوریہ کی ماں ہے) ہیں۔ فضائی دیوتاؤں میں سب سے بڑے اندر (بارش۔ رعد۔ بجلی وغیرہ کا دیوتا۔ اسی کو عبرانیوں اور اسلامیوں کا میکائیل سمجھنا چاہیئے) اور ورون (ہوا کا دیوتا) ہیں۔ ارضی دیوتا میں سب سے بڑے

اگنی (آگ کا دیوتا)، اور پرتھوی (دھرتی ماتا) ہیں۔ اگر شمار کیا جائے تو قدیم ہندوؤں کے ۳۳ کروڑ دیوتا تھے۔ لیکن جب تمدن کے ساتھ[۵] دماغ میں پختگی آئی اور خیالات میں رفعت پیدا ہوئی تو چند خاص دیوتاؤں کو چھانٹ کر انھیں درجۂ الوہیت و وحدانیت دیدیا گیا۔

مسیح سے تقریباً سات آٹھ سو برس پیشتر برہمنوں نے جنھیں کھانے کمانے کی کوئی فکر نہ ہونیکے باعث بجید فرصت تھی۔ مظاہر قدرت پر تخیل آرائی کرنی شروع کی اور ایک فلسفۂ مذہب بنام "ویدانت" ایجاد کیا۔ جس میں روح و مادہ اور اسباب و علل سے بحث کی گئی ہے۔ لیکن چونکہ ہندو الٰہیات جمہور کی رسائی فہم سے بہت دور ہے، اس لئے عام ہندوؤں کا مذہب ابھی تک وہی بت پرستی چلا آتا ہے، جسے فلسفۂ ویدانت سے کوئی تعلق نہیں۔ زمانہ حال کے ہندوؤں میں ایک اور جماعت پیدا ہوئی ہے جو خود کو "آریہ" کہتی ہے۔ ان کی تعلیمات میں وحدانیت کی جھلک بڑی حد تک نمودار ہے۔

مسیح سے چھ یا سات صدی قبل ہندو مذہب سے بودھ مذہب اور جین مت پیدا ہوئے۔ جن کے بانی گوتم بدھ اور مہابیر تھے۔ ان مصلحین نے فلسفۂ الٰہیات کو بالائے طاق رکھکر لوگوں کو صرف تزکیۂ نفس اور حقوق العباد اداکرنیکی تلقین کی۔ تمام کائنات کا مدار اُن کے نزدیک کرم یعنی اعمال پر ہے۔ یہ لوگ دیوتاؤں اور خدا کی ہستی سے منکر ہیں۔ یہ گویا الحاد ہوا۔ جو توحید کے بعد پیدا ہوتا ہے۔

مذاہب امریکہ محققین آثار نے یہ بات ثابت کردی ہے کہ کولمبس کی آمد سے قبل جو لوگ امریکہ میں آباد تھے وہ براہ الاسکا ایشیا کے شمال مشرق سے آئے تھے۔ (یہ واقعہ غالباً اب سے پانچ چھ ہزار برس قبل کا ہے) لہذا ظاہر ہے کہ ان لوگوں کے مذہبی عقائد تقریباً وہی ہونگے جو ایشیا کی مغول اقوام کے تھے۔

قطب شمالی کی قوم الیسکیمو (ESKIMO) کا عقیدہ ہے کہ دنیا ارواح رفتگان سے (جن میں زیادہ تر خبیث روحیں ہیں) معمور ہے۔ اور چونکہ یہ ارواح خبیثہ ہمیشہ انسان کے درپے ایذا رہتی ہیں۔ لہذا ضرور ہے کہ ان سے محفوظ رہنے کے لئے جھاڑنے پھونکنے والوں کی خدمات حاصل کی جائیں۔ اور اُن کو نذرانے دئے جائیں۔ ان لوگوں میں نہ کوئی دیوتا ہے نہ کوئی معبود۔ اور اس لئے اُن کے یہاں پوجا پاٹ یا عبادت بھی نہیں ہے۔ جنوبی امریکہ کے قدیم قبائل میں بھی یہی معتقدات موجود ہیں اگرچہ اُنکے خیالات مذہبی کسقدر بلند ہوگئے ہیں۔

شمالی امریکہ کے قبائل یقین رکھتے ہیں کہ ارواح رفتگان قائم رہتی ہیں۔ یعنی جب انسان مرجاتا ہے تو اُسکی روح جانب مغرب زیر زمین کسی مقام میں چلی جاتی ہے۔ (یہی ہندوؤں کا "پاتال" ہے) مگر اسکے ساتھ اُن کا عقیدہ یہ بھی ہے کہ ہر روح کا ایک "سایہ" ہوتا ہے۔ جو بعد از مرگ دنیا میں رہکر لوگوں کو ستاتا ہے۔ ان کے یہاں مختلف مظاہر قدرت کے متعلق مختلف دیوتا موجود ہیں۔

---

[۵] قدیم یونانیوں میں جو دیوتا ذیوس (ZEUS) تھا وہی رومیوں میں جیوپٹر (JUPITAR) کہلایا اور قدیم ہندوؤں میں دیوس پتر (Dayauspitar = دیوتاؤں کا باپ) نام رکھتا تھا چنانچہ یہی دیوتا شنگتی تھا۔ جو غالباً سنسکرت کے لفظ "شکتی" کی بگڑی صورت ہے (شکتی = طاقت۔ لہذا شنگتی علت العلل ہوا)

ہر دیوتا کے پجاری علیحدہ ہوتے ہیں۔ جن کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ دیوتا حسب لطلب "اُن کے سر آتے ہیں" (ہندوؤں کی چھوٹی اور جاہل قوموں کا بھی یہی عقیدہ ہے) ان کے علاوہ بڑے بڑے دیوتا الگ ہیں، سب سے بڑا دیوتا "زندگی کا دیوتا" یعنی آفریدگار ہے۔ جس کی جائے قیام آفتاب ہو (یہ دہی دیوتا ہے جو ہندوؤں میں "سورج نارائن" کہلاتا ہے) ایک دیبی "آسمان کی لافانی بڑھیا" ہے جو چاند میں رہتی ہے (چنانچہ یہاں بھی عوام میں مشہور ہے کہ چاند میں بڑھیا بیٹھی چرخہ کات رہی ہے) اول الذکر دیوتا کی ایک عجیب کرامت بتائی جاتی ہے یعنی قبائل کہتے ہیں کہ جب یہ دیوتا اپنے سُرین کھجاتا ہے تو زمین پر بارش ہوتی ہے۔

جوں جوں زمانہ گذرتا گیا۔ اُنمیں بعض قومیں زیادہ متمدن اور شائستہ ہوتی گئیں۔ اور اسی نسبت سے اُن کے معتقدات مذہبی میں بھی رفعت پیدا ہوئی۔ ان اقوام متمدن میں ایک قوم مایا (MAYA) تھی۔ اس قوم میں قدیم آریوں کی طرح ہوا کا دیوتا (ہندوؤں کا وَرُون) بارش کا دیوتا (آریوں کا اندر) افزائش نسل وفصل کی دیوی (گوری پاربتی یا پرتھوی) موت کا دیوتا (آریوں کا "یم سوراج") وغیرہ موجود تھے۔ ان دیوتاؤں کے پُجاری نہایت دولتمند اور اُنکے مندر نہایت عالیشان تھے۔ مندر کا متولی نسلاً بعد نسلٍ چلا آتا تھا۔ مایا قوم میں دو زبردست قومی ہیرو ایسے گذرے تھے جنھیں دیوتا بنا دیا گیا تھا۔ ان میں ایک کا نام "کوکل کان" (KUKALCAN) تھا (ممکن ہے "کوکل کان" دراصل "گوکل کا نھیا کانھا" رہا ہو جو سری کرشن جی کی عرفیت ہے۔) اس قوم میں انسانی قربانی کا رواج تھا، جسے کوکل کان نے منع کر دیا تھا۔ شہر چیچن اتزہ (Chichen Itza) میں ایک مقدس تالاب تھا۔ جس میں قربانی کے انسانوں کا خون ڈالا جاتا تھا۔ قومی ضرورت کے وقت سینکڑوں جوان اور کنواری لڑکیاں دیوتا پر قربان کر دی جاتی تھیں۔

پیرو (PERU) میں بھی یہی تمدن تھا۔ لیکن زیادہ ترترقی یافتہ وہاں کے لوگ بھی شرک اور بت پرستی میں مبتلا تھے۔ ان چھوٹے دیوتاؤں کے ساتھ بڑے بڑے دیوتا بھی اُنکے یہاں موجود تھے۔ ان دیوتاؤں کے بُت ٹھوس سونے کے بنائے جاتے تھے جنھیں نہایت عالیشان اور خوبصورت مندروں میں رکھا جاتا تھا۔ انکے علاوہ وہی پرانے دیوتا۔ بارش۔ بادل اور بجلی وغیرہ کے بھی پائے جاتے تھے۔ آخری زمانہ میں سورج کا درجہ سب دیوتاؤں پر غالب ہو گیا تھا۔ جسکی خدمت کے لئے مندر میں حسین وجمیل لڑکیاں رکھی جاتی تھیں (جنوبی ہند کے مندروں میں بھی ایسی دیوداسیاں موجود رہتی ہیں)

امریکہ کی دوسری قدیم قوموں میں ایک قوم تولتیق (TOLTECS) تھی جو میکسیکو میں پھیلی ہوئی تھی۔ تمام ملک میں اس قوم کے عالیشان آثار قدیمہ پھیلے ہوئے ہیں۔ اس قوم کا صنم اکبر "کوتیز الکوتل" (Quetzalcoatl) تھا جسکے معنی "پردار سانپ" کے ہیں۔ یہ دیوتا اس قوم کا "آفریدگار" تھا۔ لیکن روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دراصل "چندرمان دیوتا" تھا۔ پھر وہ ہوا کا دیوتا بن گیا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس نام کا ایک بادشاہ تھا جس نے انسانی قربانی کی رسم بند کر دی تھی، ایک روایت میں لکھا ہے کہ اس صنم اکبر کی ایک بیوی بھی تھی۔ جسے وہ لوگ اپنی زبان میں تیز کاتلی پوقا (TEZCATLIPOCA) (اندھیرے پکش کا چاند) کہتے تھے۔ یہ اخلاقیات کی دیوی تھی اور گنہگاروں کے اعمال

کی جانچ اور جزا و سزا کا کام اسی کے سپرد تھا۔

امریکہ کی ایک اور متمدن قوم آزتیک (AZTECS) تھی۔ اس قوم کا صنم اکبر سورج تھا جس پر وہ انسان کی بھینٹ چڑھاتے تھے انسانی قربانی کا اسقدر رواج کسی دوسری قوم میں نہ تھا۔ ان کے قدیم دیوتاؤں میں چندرمان دیوتا، ستارۂ صبح کی دیوی[1] افزائش نسل و فصل کی دیوی[2] اور اُتزیلوپوچتلی (Huitzilopochtli) جنگ کا دیوتا تھے۔

الغرض اول اول اِنہیں سورج۔ چاند۔ ہوا۔ بارش۔ آگ۔ رعد وغیرہ سب کے دیوتا موجود تھے۔ اور بعد کو یہ سب دیوتا ملاکر صرف ایک دیوتا بنا لیا گیا تھا اور اسی کو جزا و سزا کے اختیارات دیدیے گئے تھے۔

مذاہب عجم

جسطرح کوئی بڑا دریا اپنے سرچشمہ سے نکلکر وادی کے خشک علاقوں کو سیراب کرتا چلا جاتا ہے اور اس میں سیکڑوں ندی نالے آکر مل جاتے ہیں۔ اسی طرح مذہب بھی مختلف زمانوں میں مختلف مدارج ارتقا طے کرتا چلا جاتا ہے اور اس میں بھی اِدھر اُدھر کے مختلف خیالات و معتقدات داخل ہوتے جاتے ہیں۔ عبرانیوں کا مذہب جسے سب سے پہلا آسمانی یا الہامی دین بتایا جاتا ہے۔ مذاہب بابل۔ مصر۔ ایران اور یونان کا رہین منت ہے۔ اور انجیل میں تو ایران کے مذہب کا بہت بڑا حصہ پایا جاتا ہے۔

ایشیائے کوچک کے اس علاقہ سے جہاں قدیم زمانہ میں آریا قوم کی ہندی ایرانی شاخ آباد تھی، اہل ایران نقل و حرکت کرکے ان کوہستانوں میں جا بسے جو عراق کے شمال میں واقع ہیں۔ تقریباً ایک ہزار سال تک یہ لوگ بحالت گمنامی دخانہ بدوشی پھرتے رہے۔ اسوقت ان کا مذہب وہی تھا جو قدیم ہندوؤں کا تھا۔ رفتہ رفتہ بابل و آشوریہ کے شاندار تمدن وجود میں آئے جنھوں نے وادئ فرات و دجلہ کو رشک جنت بنادیا۔ ان کی شان و شوکت اور جلالت و عظمت دیکھ کر دنیا کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں جب روز روز کی جنگ و جدال سے دونوں تمدن خاک میں مل گئے اور بابل و نینوا کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ تو دنیا کی حکومت ایرانیوں کے ہاتھ آگئی۔

ان قدیم ایرانیوں کی مقدس کتب ژند و اوستا کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں بھی حسب معمول بیشمار روحوں کا عقیدہ پایا جاتا ہے۔ ہر ملک۔ صوبہ۔ شہر۔ گاؤں۔ دریا اور درخت وغیرہ کا ایک دیوتا تھا اور روحوں کے بقا کے قائل تھے۔ اُنکے یہاں سعید اور خبیث دو قسم کی روحیں تھیں، ان سب پر ایک آسمانی خدا تھا جس کا نام متراز (MITHRA) ہے اور اسی کے ساتھ ہندو مذہب کے اور دیوتا بھی پائے جاتے تھے، مگر بعد میں ایرانی اور ہندو مذہب میں بہت کچھ اختلاف ہوگیا۔ ہندوؤں کا

---

[1] جیسے یونانیوں میں وینس (VENUS) رومیوں میں جونو (JUNO) آشوریوں میں اشتارتہ (ASTARTE) عرب میں زہرہ اور ایرانیوں میں ناہید کہتے تھے۔ [2] مصریوں کے یہاں آتور (ATHOR) کے نام سے یونانیوں کے یہاں آفرودیتہ (APHRODITE) کے لقب سے اور ہندوؤں کے یہاں پاربتی و پرتھوی کے نام سے موسوم تھی۔

"دیو" ایران میں "شیطان" بن گیا۔ اور جو ہستی ہندوؤں میں "اسُر" کہلاتی تھی وہی ایران کا "اہور" بن گئی۔ علاوہ ازیں ماحول اور آب ہوا کے اثر سے دیگر اختلافات بھی پیدا ہو گئے لیکن "اگنی پوجن" (آگ کی پوجا) دونوں میں بدستور باقی رہی۔

چھٹی یا ساتویں صدی قبل مسیح میں ایران کے اندر ایک جدید مصلح یا پیغمبر کا ظہور ہوا جس کا نام "زرتشتر" (زرتشت یا زردشت) ہے۔ اس پیغمبر نے مذہب ایران کی صورت بدل دی اور اسمیں زیادہ پاکیزگی اور روحانیت پیدا ہو گئی۔ زرتشت میں چھوٹے چھوٹے دیوتا سب غائب ہو گئے۔ صرف دو طاقتیں باقی رہ گئیں۔ آہور امزدا (خدائے خیر) اور اہرمن (خدائے شر) یا بالفاظ دیگر یزداں و شیطان۔ اس مذہب میں بھی مصریوں کی طرح یہ عقیدہ موجود تھا کہ انسان کی روح بعد موت باقی رہتی ہے اور اعمال نیک و زشت کی جزا و سزا ملتی ہے۔ لیکن زرتشت نے اس عقیدہ کو اور زیادہ تقویت دی۔ نیکوکاری اور پاکدامنی پر بہت زیادہ زور دیا۔ اس مذہب کا یہ عقیدہ ہے کہ قوت خیر کے علاوہ ایک زبردست قوت شر بھی ہے۔ اور اس کے ساتھ بیشمار "اخوان الشیاطین" موجود ہیں۔ آہور امزدا یعنی قوت خیر نے ڈھیل ڈال رکھی ہے۔ لیکن وہ بالآخر ان تمام شیاطین کا استیصال کر دے گا۔ اُس وقت "آسمانی سلطنت" کا دور دورہ ہوگا۔ پہلی دنیا بذریعہ آتش تباہ کر دی جائیگی۔ تمام شیاطین ہلاک ہو جائینگے نیکوکاروں کو مسرت ابدی کا انعام ملے گا۔ جن لوگوں کے اعمال زشت ہیں انھیں میعادی سزائیں ملیں گی۔ لیکن جب وہ گناہوں سے پاک ہو جائیں گے تو بہشت میں داخل کر دیے جائیں گے۔ اور بالآخر بہشت ہی بہشت رہ جائے گی۔

کچھ عرصہ کے بعد اس مذہب کے عقائد میں اختلال پیدا ہوا۔ بابلی تمدن کا اثر رنگ لایا۔ پرانا خدا "متھرا" (MITHRA) جو قدیم زمانہ میں ایک موہوم آسمانی دیوتا تھا۔ اب آہور امزدا کے بجائے تختِ اجلال پر آ بیٹھا اور مستقل طور پر "سورج نارائن" ہو گیا۔

ایران سے یہ مذہب "متراثیت" رومی دنیا میں پہونچا۔ چنانچہ ابتداء مسیحیت کے وقت تک روم میں موجود تھا۔ چنانچہ ہر سال ۲۵ دسمبر کو مترا دیوتا کا جشن میلاد منایا جاتا تھا جسکی ولادت ایک پوشیدہ غار میں ہوتی تھی۔ یہی زمانہ "سورج نارائن" کی پیدائش" یعنی آغاز عروج کا ہوتا ہے اور دن بڑا ہونے لگتا ہے) مترا کے بھگتوں کو خون سے بپتسمہ دیا جاتا تھا۔ اور وہ سخت ریاضتیں کیا کرتے تھے۔

فلسطین

ارض فلسطین ایک چھوٹا سا ملک ہے جسکا محل وقوع اسطرح واقع ہوا ہے کہ اسکے چاروں طرف بڑی بڑی سلطنتیں واقع تھیں۔ یعنی مشرق میں بابل، جنوب مغرب میں مصر، شمال میں سلطنت حطیون (HITTILES) سواحل پر فنیقیہ (PHOENICIA) ان تمام سلطنتوں کی فوجیں اور سوداگروں کے قافلے فلسطین سے گذرتے تھے۔ جن کا سلسلہ ہزاروں برس تک جاری رہا۔ آخر میں آ کر ایرانیوں، یونانیوں اور رومیوں نے بھی اس ملک کو روند ڈالا۔

یہ باور کرنیکے لئے کافی وجوہ ہیں کہ جس پُراسرار قوم کو قدیم عبرانی "فلسطینی" (PHILISTINES) کہا کرتے تھے وہ دراصل جزیرہ کریٹ سے ہجرت کر کے آئی تھی۔ اور اپنے ساتھ سلیمان سے بھی پہلے کا قدیم تمدن لائی تھی۔

مسیح سے تقریباً تیرہ سو برس پہلے جب عبرانی قوم عراق سے ہجرت کرکے صحرا و بیابان کو عبور کرتی ہوئی حدود شام میں پہونچی تھی۔ اسوقت وہ مشکل متمدن و مہذب کہی جا سکتی تھی۔ ان کا قومی معبود یاہوہ (JEHOUAH) تھا۔ یہ آسمانی خدا غالباً اسی قسم کا تھا جسطرح دیگر قدیم اقوام وملل میں آسمان، سورج و رعد کے دیوتا ہوا کرتے تھے۔ اگر عہد نامہ عتیق کے ابتدائی صحف کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ان کے مضامین معیار اخلاق سے اسقدر گرے ہوئے ہیں۔ کہ اُن کا اور اخلاق مصر۔ بابل و ایران کا کوئی مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ اول اول یہ ایک خانہ بدوش پہاڑی قوم تھی، جسکا مشغلہ صرف مویشی۔ پالنا تھا۔ اسکے بعد جب گرد و نواح کے تمدن کا اثر پڑا تو اُن کے خیالات میں وسعت و رفعت پیدا ہو گئی، اور جب ساتویں اور چھٹی صدی قبل مسیح میں زیادہ روشن خیال "انبیاء بنی اسرائیل" پیدا ہوئے تو معیار اخلاق اور بلند ہو گیا جیسا کہ اُن کے صحف سے ثابت ہوتا ہے۔ پانچویں صدی میں جب بنی اسرائیل گرفتار ہو کر بابل گئے تو وہاں کی باتیں بھی اُنھوں نے سیکھیں۔

اسکے بعد مسیح اور ارتقاء مسیحیت کا زمانہ آیا۔ اور عبرانیوں کا فطری مذہب کسی قدر ترمیم و تہذیب کے بعد دنیا کا اخلاقی مذہب بن گیا۔

یورپ اقوام فن (فنلینڈ (FINNLAUD) مجار (MAGAYARS باشندگان ہنگری) اور ترک کے علاوہ جتنی ایشیائی قومیں ہیں وہ اور یورپ کی تمام اقوام وملل قوم آمیا کی نسل سے ہیں۔ جو ایرانیوں اور ہندوؤں کی مورث اعلیٰ تھی ایک شاخ اس قوم کی جانب مغرب پہونچی اور سواحل بحیرہ بالطیق پر متسلط ہو گئی۔ یہ تیوتانی (TEUTONS) کہلائی دوسری شاخ جانب جنوب گئی اور یونان و اطالیہ پر قبضہ جما لیا۔ تیسری شاخ وسطی ممالک میں رہی اور وہ اب سلاوی (SLAVO) کہلاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ کی تمام قدیم اقوام کا مذہب تقریباً ایک ہی تھا۔ یونانیوں کا سب سے بڑا آسمانی دیوتا ذیوس (ZEUS) تھا جو روم میں جیوپتر (JUPITAR) کہلایا اور ہندوؤں میں اسی کو دیوپتر کہنے لگے۔ دراصل ان تمام ناموں کا مادہ لفظ دیو (DEVA) ہے۔ یونانیوں اور رومیوں کی "دھرتی ماتا" اس آسمانی باپ کی بیوی تھی، دونوں قوموں میں جنگ کا دیوتا موجود ہے۔ جو یونان میں "ایریس" (ARES) اور رومیوں میں "مارس" (MARS) کہلایا۔ آگ کا دیوتا یونانیوں میں ہفاستوس (HEPHAESTOS) اور رومیوں میں ولکن (VULCAN) ہوا (اور یہی قدیم ہندوؤں کا اگنی تھا) پانی کے دیوتا کا نام یونانی زبان میں پوسی آئڈن (POSEIDON) اور رومی زبان میں نپچون (NEPSTUNE) ہے (اور یہی ہندوؤں میں شاگرد دیوتا کہلاتا ہے) یونانیوں میں عشق و محبت کی دیوی آفرودیتہ (APHRODITE) ہے اور رومیوں میں وینس (VENUS) کہلاتی ہے یہی بابلیوں کی اشتار۔ عربوں کی زہرہ اور ایرانیوں کی ناہید ہے)

ناروے۔ سویڈن۔ جرمنی۔ اور انگلستان کے قدیم باشندے بھی یہی مذہب رکھتے تھے۔ ہفتہ کے دنوں کے ناموں پر غور فرمایئے۔ خود بخود معلوم ہو جائے گا مثلاً سنڈے (SUNDAY = آفتاب کا دن۔ ہندی آدیتوار یا اتوار) منڈے (MONDAY = MOONSDAY = چاند کا دن) ٹیوزڈے (TUESDAY = TUISCOSDAY = MERCURYSDAY)

وڈنسڈے (WEDENSDAY = MARSDAY = WODENSDAY) ووڈن اور مارس دونوں جنگ کے دیوتا ہیں)
اسی طرح جیوپٹر کو تھورس (THOR S) کہا جاتا تھا جس سے تھرسڈے (THURSDAY)، باوینس کو فریجا کہتے تھے
اس سے فریجاسڈے (FRIDAY) اسی طرح سٹرڈے دراصل سیٹرن (SATURN) (زحل) سے بنا۔

ان ناموں سے آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ قدیم اقوام یوروپ کا مذہب دراصل مظاہر فطرت کا مذہب (NATURE RELIGION) تھا۔ اور اسکے علاوہ۔ درختوں۔ دریاؤں۔ جنگلوں۔ کنوؤں وغیرہ کے بھی دیوتا پوجے جاتے تھے۔ (ہندوؤں میں اسی قسم کے سینکڑوں دیبی اور دیوتا موجود ہیں۔) الغرض عہد تاریخ میں قدم رکھنے سے پہلے تمام یوروپ کا وہی قدرتی مذہب تھا جو دیگر اقوام عالم کا تھا۔ دیوتاؤں اور دیویوں میں بعض بزرگان قوم بھی شامل کر دئے جاتے تھے (جیسے ہندوؤں میں رام اور کرشن موجود ہیں)، یونانیوں کے آسمانی دیوتا کوہ اولمپس (OLYMPUS) پر رہتے تھے اور وہیں اُنکی بہشت تھی۔ اسی طرح ایرانیوں کی بہشت بھی کوہ البرز پر تھی۔ اور ہندوؤں کے دیوتا کیلاش اور میرو پربت پر رہتے ہیں۔

جوں جوں زمانہ گذرتا گیا۔ یونانیوں کے خیالات میں بھی وسعت پیدا ہوتی گئی۔ رفتہ رفتہ حکماء کے خیال سے تمام مختلف دیوتا محو ہو گئے۔ اور وہ آخر میں توحید پرست ہو گئے۔ چنانچہ سقراط۔ افلاطون اور ارسطو کا یہی مذہب تھا۔ لیکن حکیم زینو (ZENO) اور ابیقورس (EBICURUS) ملحد تھے وہ کسی خدا یا دیوتا کو نہیں مانتے تھے۔

مسیح سے تقریباً ایک ہزار سال قبل یونانیوں نے یوروپ کے قدیم قبائل کا دیوتا "ڈیونی سوس" (DIONYSOS) بھی اپنے دیوتاؤں میں شامل کر لیا۔ یہ دراصل شراب اور فسق و فجور کا دیوتا تھا۔ یہ ہر سال مرتا اور دوبارہ زندہ ہوتا تھا۔ انکے تہوار خاص اہتمام سے منائے جاتے تھے۔ سوانگ اور تماشے ہوتے تھے۔ جلوس نکالے جاتے تھے۔ لیکن دراصل ان تہواروں کے مقصد اس حقیقت کی یاد دلانا تھی کہ ایک بار زمین کی قوت نمو مر جاتی ہے۔ جیسے خزاں سمجھنا چاہیئے۔ اور پھر پیدا ہو جاتی ہے، جو موسم بہار ہے۔ مصر، شام اور بابل میں بھی اسی قسم کے تہوار منائے جاتے تھے۔ جنمیں دیوتا مر کر زندہ ہوتا تھا۔

الغرض جملہ مذاہب قدیمہ پر سرسری نظر ڈال کر یہ باتیں معلوم ہوتی ہیں کہ (۱) عہد وحشت میں انسان کا اعتقاد یہ تھا کہ اسکا ایک سایہ یا ہمزاد ضرور ہے اور مرنے کے بعد روح اسی دنیا میں رہتی ہے (۲) روحیں سعید و خبیث دو قسم کی مانی جاتی تھیں جو انسان کو فائدہ یا نقصان پہونچا سکتی تھیں۔ (۳) قدرت کی ہر چیز میں روحوں یا دیوتاؤں کا خیال پیدا ہوا اور سینکڑوں بن گئے۔ (۴) متعدد دیوتاؤں میں سے چند کو بلند مرتبہ دیکر مذہب میں روحانیت پیدا کی گئی (۵) متعدد دیوتاؤں کو باہم ملا کر ایک بڑا دیوتا بنایا گیا۔ اور اس طرح توحید کی طرف میلان ہوا۔ (۶) توحید پرستی کے اندر ہی غور و خوض کرتے ہوئے روحانیات و الٰہیات سے لا ادریت پیدا ہوئی اور احکام مذہب احکام اخلاق و حسن معاشرت بنگئے۔ (۷) روحانیت غائب ہونے کے بعد ذات واجب الوجود کا اعتقاد متزلزل ہوا اور الحاد کی بنیاد پڑی۔ جیسا کہ فرانس اور امریکہ میں آج کل نظر آ رہا ہے۔

مسیحیت | قدیم موسوی یا یہودی مذہب میں چند ترمیمیں کرنے کے بعد عیسائی مذہب بنایا گیا۔ اس کی تعلیم اخلاقی ہے۔ ہر

بات میں تزکیہ نفس بلکہ نفس کشی کی ہدایت پائی جاتی ہے۔ اس مذہب کے بانی مسیح خیال کئے جاتے ہیں۔ اناجیل اربعہ جن میں مسیح کی سوانحعمری اور اُنکی تعلیم ہے، وفات مسیح کے بہت دنوں بعد اُنکے حواریئن نے لکھی تھیں۔ مسیح کی نسبت یہ عقیدہ ہے کہ (۱) وہ اپنی والدہ مریم کے بطن سے بغیر باپ کے پیدا ہوئے اور مریم کنواری تھیں۔ اسلئے مسیح ابن اللہ ہیں (۲) یسوع نے حسب اقتضاء وقت شریعت موسوی میں ترمیم و تنسیخ کی اور ایک جدید اصلاح شدہ مذہب اخلاق جاری کیا (۳) علماء یہود نے یسوع پر بغاوت کا الزام لگایا اور رومی حاکم کے فرمان سے وہ مصلوب کرکے دفن کردئے گئے (۴) تین دن بعد وہ اپنی قبر سے زندہ ہوکر باہر نکلے۔ اور اپنے شاگردوں سے مل کر انھیں آخری ہدایات کیں۔ اور پھر آسمان پر اپنے باپ خدا کے پاس چلے گئے۔ (۵) آدم نے خدا کے حکم کی نافرمانی کرکے تمام بنی نوع انسان کو گنہگار بنایا۔ مسیح نے مصلوب ہوکر انسان کے گناہوں کا کفارہ کردیا۔ (۶) قیامت کے قریب مسیح دوبارہ دنیا میں آئیں گے۔ (۷) مسیح مامور من اللہ تھے اور اُنکا مذہب الہامی ہے۔

جب مسیحیت کو دیگر قدیم مذاہب کے ساتھ رکھکر دیکھا جاتا ہے تو انسان حیران رہ جاتا ہے۔ کہ جس مسیحیت کو الہامی مذہب بنایا جاتا ہے وہ صرف قدیم مذاہب کی مختلف روایات و عقائد کا مجموعہ ہے۔ جسے مختلف رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً جب کوئی جویائے حق جو مسیحیت سے بھی واقف ہے قدیم مصری مذہب و رسوم کے حالات پڑھتا ہے تو اسے معلوم ہوجاتا ہے کہ اعمال کی جانچ کی تعلیم جو مسیحیت پیش کرتی ہے وہ مسیح سے کم از کم پانچ ہزار سال پیشتر میں موجود تھی۔ وہ دیکھتا ہے کہ مسیحیت حقیقتاً تثلیث کی آڑ میں شرک ہے لیکن دیگر مذاہب قدیمہ میں خالص روحانیت اور توحید پرستی مسیح سے صدیوں پہلے موجود تھی۔ وہ دیکھتا ہے کہ زبور کی بہترین دعائیں وہی ہیں جو دیگر مذاہب کی دعاؤں سے لی گئیں۔ وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ اکثر قدیم مذاہب میں ایک آسمانی دیوتا کسی کنواری عورت پر اپنا پرتو ڈالکر حاملہ کردیتا ہے اور پھر ایک بیٹا پیدا ہوتا ہے۔ جو الوہیت سے متصف ہوتا ہے وہ دیکھتا ہے کہ اسکندریہ میں جہاں مسیحیت نے زیادہ تر نشو و نما پائی قدیم مصریوں کے اندر حد درجہ کی رہبانیت تھی۔ پاکدامنی کو اُنھوں نے ایک دیوی بنا رکھا تھا۔ اور اس دیوی کے مندر میں صدہا کنواریاں رہا کرتی تھیں۔

جب وہ بابلی مذہب کی سیر کرتا ہے تو دیکھتا ہے کہ اُسکے مقتدایان دین بھی۔ تکوین عالم۔ تخلیق آدم۔ ہبوط آدم۔ جنات عدن۔ اور طوفان کی وہی روایتیں سُناتے ہیں۔ جو یہود و نصاریٰ کے یہاں پائی جاتی ہیں۔ قدیم بابلیوں میں بھی ایک دن یوم سبت ہوتا تھا۔ وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ جس طرح عیسائی لوگ مریم کو ایک دیوی اور پاکدامنی کا نمونہ سمجھتے ہیں۔ اسی طرح اہل بابل اشتار دیوی کو نکوکاری اور پارسائی کی دیوی مانتے تھے۔ آخر میں وہ یہ بھی دیکھے گا کہ بابلیوں کا مذہب ترقی کرتے کرتے توحید پرستی ہوگیا تھا۔ حالانکہ مسیحیت کو آجتک یہ سعادت نصیب نہیں ہوئی۔ وہ یہ بھی دیکھیگا کہ بابلیوں کا ایک ہر لعزیز خدا ہر سال مرکر زندہ ہوتا تھا، اور اس کا دھوم دھام سے جشن منایا جاتا تھا۔ بابلیوں نے اپنے مذہب میں مسیح کی طرح ایک نجات دہندہ خدا بھی مان رکھا تھا۔

جب وہ ایران قدیم کے مذہب کی سیر کرتا ہے۔ تو دیکھتا ہے کہ مسیح سے صدیوں پیشتر وہاں ایک مصلح یا پیغمبر پیدا ہوا

جس نے لوگوں کو اعتدال پسندی، نکوکاری اور پارسائی کی تلقین دے کر ایک خالص روحانی مذہب سکھایا وہ دیکھے گا کہ ایرانیوں میں صدیوں پیشتر یہ عقیدہ موجود تھا کہ خدائے بزرگ و برتر ایک روز تمام کائنات کو بذریعۂ آتش نابود کر دے گا۔ بعد ازاں "آسمانی بادشاہت" کا دور دورہ ہوگا۔ لوگوں کے اعمالنامے جانچے جائیں گے۔ نیکوں کو جزا اور بدوں کو سزا دیجائے گی۔

ایران کے مذہب متھرائیت میں وہ یہ بھی دیکھے گا کہ اُن کا ایک دیوتا ہر سال ۲۵ دسمبر کو ایک غار میں پیدا ہوتا ہے جسکا جشن مولود ہر سال نہایت تزک و احتشام سے منایا جاتا ہے۔ یہ دیوتا بنی نوع انسان کے گناہوں کا تمام بوجھ اپنے سر لے لیتا ہے۔ روم میں اسی دیوتا کی پیدائش کے دن یعنی ۲۵ دسمبر کو ہر سال سرکاری طور پر تعطیل ہوتی تھی۔ (یہی عیسائیوں کا بڑا دن ہے) الغرض وہ یہ دیکھتا ہے کہ عیسائیت میں کوئی بات ایسی نہیں جو دیگر مذاہب قدیمہ سے نہ لی گئی ہو۔ (باقی)

جنوری ۳۱ء کا نگار

کیسا ہونا چاہیئے اس کے متعلق ناظرین کرام کی جو رائیں موصول ہو رہی ہیں وہ بہت مختلف ہیں۔ بعض چاہتے ہیں کہ مجموعۂ استفسارات ہو اور بعض کی خواہش یہ ہے کہ پورا پرچہ میرے مضامین سے پُر ہو۔ میں نے اس اختلاف رائے کو دیکھ کر جو فیصلہ کیا ہے وہ ان دونوں سے بالکل علٰحدہ ہے۔ میں ابھی اس فیصلہ کو بالکل راز میں رکھنا چاہتا ہوں کیونکہ بالکل ممکن ہے کہ اس کے متعلق بھی اختلاف و اتفاق کا جھگڑا پیدا ہو جائے۔ اور پھر میں کچھ نہ کر سکوں۔ لیکن یہ یقین دلانا چاہتا ہوں کہ جنوری ۳۱ء کا نگار ۰ ۶ صفحات کا ہوگا اور جو کچھ اس میں ہوگا وہ نہ صرف نہایت دلچسپ و مفید بلکہ جدید و لذیذ بھی ہوگا یقیناً اس میں کسی شاعر کے کلام پر تنقید نہ ہوگی۔ نہ یہ مجموعۂ استفسارات ہوگا۔ بلکہ یہ ان سب سے علٰحدہ اک اور چیز ہوگا جس کا اظہار میں نہیں کرنا چاہتا۔

نیاز

صحابیات

جس میں عہد سعادت کی ۵۰ خواتین کے مستند حالات یکجا کر دیئے گئے ہیں۔ اسکا مقدمہ مولانا نیاز نے خاص اپنی انشا میں اسقدر جوش و قوت کے ساتھ لکھا ہے کہ مسئلہ نسائیت کے بہت سے نکات اس سے حل ہو جاتے ہیں۔ قیمت علاوہ محصول ۱۲؎

مینجر "نگار" لکھنؤ

نظامی گنجوی کا نایاب وگمشدہ دیوان

ایک جوہر گرانمایہ کی دستیابی

مولانا نظامی رحمۃ اللہ علیہ چھٹی صدی ہجری کی اُن مقتدر اور مایۂ ناز ہستیوں میں تھے جنکے کمال کو ہر فرد مانتا تھا اور بہ لحاظ تصنیف اُن کا شمار ایسے لوگوں میں تھا جنکی تقلید واتباع کو لوگ فخر جانتے تھے۔ اُن کے مخزن اسرار کے سینکڑوں جواب لکھے گئے۔ ایران کا جو مشہور شاعر اُٹھا۔ اُس نے سب سے پہلے خمسے کے جواب کے لئے قلم اٹھایا۔

دوسری تیسری صدی ہجری سے ایران میں ادبیات کے مٹے ہوئے نقش پھر اُبھر آئے تھے۔ شاعری ترقیوں کے مدارج طے کر رہی تھی۔ ہر صنف کلام میں جان پڑتی جاتی تھی۔ اور ہر شعبہ میں ایک انداز کا اضافہ ہو رہا تھا۔ مگر یہ ترقی ایک محدود دائرہ اور ایک خاص حد سے باہر نہیں نکلی تھی۔ ایک منزل خاص مقرر تھی کہ ہر ایک وہاں پہونچکر یا خود ٹھہر جاتا تھا یا اتنی سکت ہی باقی نہ رہتی تھی۔ کہ دو چار قدم اور آگے بڑھے۔ اسمیں کسکو کلام ہے کہ عسجدی۔ فرخی۔ حکیم ناصر خسرو۔ غضائری رازی۔ بندار رازی۔ امیر معزی۔ اسدی۔ طوسی۔ عنصری۔ فردوسی۔ ابوالعلا گنجوی۔ انوری۔ وغیرہ سب کے سب خدائے سخن تھے۔ اور ایک راستہ نکال گئے۔ نظامی بھی اگر اسی راستہ پر آنکھیں بند کر کے چلتے تو زیادہ سے زیادہ وہ بھی اسی منزل پر پہونچ جاتے جسپر یہ سب پہونچے تھے۔ مگر اُنھوں نے صرف اتنی بات کو اپنا مطمح نظر نہیں بنایا۔ وہ اور آگے بڑھے اور اتنا بڑھے کہ پیشرو تو پیشرو اونکے پس روؤں میں بھی کوئی شخص وہاں تک نہیں پہونچا۔ اُنھوں نے نظم میں جس جس چیز کو ترقی دی اُنکی تفصیل کے لئے گو زیادہ وقت کی ضرورت ہے۔ مگر مجملاً یہ ہے۔ کہ شعر کو چار چاند لگا دئے۔ اور اُنھیں پہلے نقوش میں معمول سے زیادہ گلکاریاں کیں۔ کلام میں زور بڑھایا۔ بلاغت کو فصاحت کے ساتھ شامل کیا۔ استعارات میں جدت۔ تشبیہات میں اختراع سے کام لیا۔ قوت خیال کو بہت بڑھایا۔ سادگی میں رنگینیاں پیدا کیں۔ اور بہت سی باتیں ایسی ایجاد کیں جنکی وجہ سے انکو بڑے نقادوں نے موجد تسلیم کر لیا۔ سب باتوں کو نظر انداز کر کے اگر صرف اسی بات کو مدنظر رکھا جائے کہ اُسوقت تک جتنے شعرا تھے وہ صرف ایک ایک چیز میں باکمال تھے۔ مثلاً فردوسی صرف رزم کے۔ خیام فلسفہ کے۔ انوری قصائد کے۔ سنائی نصائح کے۔ تو بھی نظامی کا درجہ بہت بلند رہتا ہے۔ کیونکہ اُنھوں نے سب چیزوں کو اپنے کلام میں اسطرح جمع کر دیا کہ دیکھنے والے کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ

ہر صنف کلام میں عمر کا پورا حصہ صرف کیا ہے۔ رزم۔ بزم۔ وعظ و پند۔ تصوف۔ عاشقی و سرمستی۔ اخلاق۔ فلسفہ۔ غرضکہ یہ تمام چیزیں تنہا انکے کلام میں نظر آتی ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ ہر چیز گل سرسبد ہے۔

آج اگر دیکھا جاتا ہے تو نظامی کا نام صرف اُن کے خمسے کے نام سے اور خمسے میں بھی بیشتر سکندر نامہ کے نام سے زندہ ہے باقی نقوش غیر فانی ہی سہی مگر اتنے دھندلے اور اتنے تاریک ہیں جو نظر نہیں آتے۔

یہ بات کسی طرح قیاس میں نہیں آتی کہ اُنھوں نے عاشقانہ شاعری بھی اُسی درجہ کی نہ کی ہو۔ جو اُن کے شایان شان تھی۔ مگر تعجب ہے کہ اُنکا عاشقانہ کلام ایسا گم ہے کہ اب اُسکے متعلق شکوک اس درجہ پر پہونچ گئے ہیں کہ کوئی صحیح صحیح یہ بھی نہیں بتا سکتا کہ کب تھا؟ کہاں تھا؟ اور تھا تو کتنا تھا؟ کس انداز کا تھا؟ کس نے اُسکو جمع کیا۔ اور کیا کیا اوسمیں موجود تھا یہ تو سب کہتے ہیں کہ اونکا عاشقانہ کلام جسکو دیوان کے نام سے نامزد کیا جاتا ہے تھا۔ مگر اسمیں سخت اختلاف ہے کہ کتنا تھا؟ اور کس رنگ کا تھا؟ نقادوں نے سخت سے سخت تحقیقاتیں کیں ہیں مگر دیوان کی نایابی نے سب کی آنکھوں پر شکوک واوہام کے گہرے پردے چھوڑ دئے۔ دیوان تھا اور ضرور تھا۔

دولت شاہ سمرقندی نے لکھا ہے کہ اُنکے قصائد۔ موشحات۔ اور صنائع وغیرہ کے بیس ہزار شعر ہیں۔ مگر جب لکھتے ہیں تو ثبوت میں صرف ایک غزل کے آٹھ شعر نقل کرتے ہیں۔

شب تیرہ است درہ مشکل خبیت راعناں درکش　　　زمانے رخت ہستی را بخلوت گاہ جاں درکش
نظامی ایں چہ اسرار است کز خاطر بروں کردی　　　کسے رمزش نمی داند عناں درکش عناں درکش

بیس ہزار شعروں کے دیوان کا ذکر کرکے ایک قصیدہ نما غزل کے آٹھ شعر نقل کرنیکے اسکے سوا اور کوئی معنے نہیں ہیں کہ سمرقندی نے صرف ایک سُنی سُنائی بات لکھدی ہے۔ دیوان ہرگز نظر سے نہیں گزرا۔

لطف علی آذر اپنے آتشکدہ میں دیوان کا ذکر ان الفاظ کے ساتھ کرتے ہیں:-

"گویند بیست ہزار بیت از قصائد و غزلیات و قطعات و رُباعیات سوائے خمسہ داشتہ کہ حال درمیاں نیست ایں چند بیت از تذکرہ چند ملاحظہ و انتخاب شد۔"

یہ لکھکر اکثر اشعار نقل کئے ہیں۔ مگر اس بات سے انکار کی گنجائش ہی نہیں ہے کہ دیوان اُنھوں نے بھی اپنی آنکھ سے نہیں دیکھا بہت ممکن ہے کہ صرف دولت شاہ کے تذکرہ میں دیکھ کر تعداد اشعار لکھدی ہو۔ اور دوسری جگہوں سے منتخب اشعار کو نقل کر دیا ہو۔

عوفی یزدی نے اپنے **لباب الالباب** میں بہت صاف صاف کہدیا ہے کہ ان (موجودہ) مثنویوں کے سوا نظامی نے بہت کم شعر لکھے ہیں۔ اس کے بعد ایک شخص کی زبان سے سُنے ہوئے کچھ شعر لکھدئے ہیں۔ باقی کوئی ذکر دیوان کا نہیں کیا۔

کشف الظنون میں دیوان نظامی کا ذکر ہے۔ مگر وہ صرف ذکر ہی ذکر ہے۔

مصنف تذکرہ مجمع الفصحا نے کچھ شعر قصائد کے کچھ غزلیں اور ایک رباعی نقل کر دی ہے دیوان کے دیکھنے نہ دیکھنے کا کوئی ذکر نہیں۔

یورپ کے مشہور و معروف مستشرق ڈاکٹر ایتھے نے انسائیکلوپیڈیا میں نظامی پر ایک مفصل مضمون لکھا ہے اوسمیں دیوان کا بھی ذکر کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ سنہ ۵۸۴ھ میں اُنھوں نے اپنا دیوان خود مرتب کیا۔ اور اس بات کی تردید کی ہے کہ اُنکے دیوان میں بیس ہزار شعر ہیں۔ بلکہ لکھا ہے کہ اس دیوان کے چند نسخوں میں جو ہمکو دستیاب ہوا اشعار کی ایک قلیل تعداد موجود ہے۔ مگر یہ تحقیق تذکرہ دولت شاہ کے مصنف کی تحقیق کے سراسر خلاف ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ نظامی کا انتقال سنہ ۵۷۶ھ میں ہوا۔ اگرچہ اسمیں کلام نہیں ہے کہ اونکے سن وفات میں سخت اختلاف ہے جیسا کہ مولانا شبلی لکھتے ہیں کہ تقی کاشی سنہ ۶۰۶ھ اونکا سال وفات لکھتے ہیں اور مولانا کا خود بھی یہی خیال ہے کہ سنہ ۵۹۹ھ کے بعد اُنکی وفات ہوئی۔

ایک اور مستشرق ڈاکٹر **ولہم باخر** جنھوں نے نظامی کے حال میں ایک محققانہ کتاب لکھی ہے۔ وہ بھی شہادت دیتے ہیں کہ انکا دیوان موجود تھا جو سنہ ۵۸۴ھ میں لیلیٰ مجنوں کے تصنیف کے ساتھ ساتھ مرتب ہوا تھا اور اسکا ثبوت یہ کہ اونکو نظامی کے اس کلام سے ملا ہے۔

روزے بہ مبارکی و شادی　　بودم بہ نشاط کیقبادی
ابروئے ہلالیم کشادہ　　دیوان نظامیم نہادہ
آئینۂ بخت پیش رو یم　　اقبال بہ شانہ کردہ مویم
در حال رسید قاصد راہ　　آورد مثال حضرت شاہ

اس سے معلوم ہوا کہ جسوقت شاہی قاصد مثنوی لیلیٰ مجنوں کے لکھنے کے لئے حکم لایا تو یہ اپنا دیوان دیکھ رہے تھے یا مرتب کر رہے تھے۔

ان شہادتوں کے علاوہ بعض بیرونی شہادتیں بھی ملتی ہیں جن سے نظامی کے دیوان یا کلام عاشقانہ کا ثبوت ملتا ہے۔ چنانچہ مولانا عبد القادر بدایونی نے نظیری کے حال میں لکھا ہے کہ اس نے شیخ نظامی کے قصیدے کے تتبع میں جسکا مطلع یہ ہے ؎

ملک الملوک فضلم بہ فضیلت معانی　　زمی و زماں گرفتہ مثال آسمانی

اسی طرح حضرت شاہ نعمت اللہ نے سنہ ۷۷۰ھ میں نظامی کے اسی قصیدے کے تتبع میں ایک قصیدہ لکھا ہے جسکا ایک شعر یہ ہے ؎

بجہاں کجا نظامی کہ بہ طیبتش بگویم　　کہ من ایں ترانہ گفتم تو بگو اگر توانی

جامی نے بھی ایک غزل نظامی کی غزل کے جواب میں لکھی ہے۔ یہ سب باتیں ایسی ہیں جن سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ اُنکا دیوان موجود تھا۔ اور اُنکا کلام عاشقانہ قابل اتباع تھا۔

خود نظامی کے خمسہ میں بعض بعض شعر ایسے موجود ہیں۔ جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ عاشقانہ غزلیں کہتے تھے مثلاً

غزلہائے نظامی را غزالاں　　　زدہ بر زخمہائے چنگ نالاں

ایسے ایسے متعدد شعر اونکی مثنویوں میں موجود ہیں جو تائید کرتے ہیں کہ وہ غزل کہتے تھے۔ اور خوب کہتے تھے۔ مولانا شبلی ان کے دیوان کی بابت شعر العجم میں لکھتے ہیں "پنج گنج کے سوا نظامی کا اور بہت سا کلام تھا جو آج مفقود ہے۔" اس کے بعد دولت شاہ کا قول نقل کرتے اور تنقید کرتے ہوئے فرماتے ہیں "تعجب یہ ہے کہ عشقیہ شاعری کی نقش آرائیاں انھیں کی بدولت وجود میں آئیں۔ لیکن غزلیں پھیکی اور بے مزہ ہیں۔" اگرچہ ہمکو مولانا کے اس قول سے اتفاق نہیں ہے کہ اونکی غزلیں بیمزہ اور پھیکی ہیں۔ کیونکہ جس شخص سے عاشقانہ شاعری کا وجود ہوا۔ پھر اوسکے یہاں ایسے کلام کا پھیکا ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ پھر بھی مولانا کے اس قول سے ہماری اتنی تائید ہوتی ہے کہ نظامی کا دیوان موجود تھا۔ ہرچند کہ مولانا نے دیوان اپنی نظر سے نہیں دیکھا۔ اور نہ بغیر دیوان کے دیکھے ہوئے یہ تنقید کرنے کا حق تھا۔ پھر بھی اتنی تائید بہت کافی ہے۔

مگر پروفیسر براؤن جو آخری دور کے ایک زبردست مستشرق اور کامل محقق تھے۔ ان سب شواہد کے باوجود بھی سب سے الگ ہیں۔ اور ان کو اس باب میں سخت تامل ہے کہ مثنویات کے علاوہ نظامی کا کوئی اور کلام بھی تھا۔ لطف یہ ہے کہ انکو ایک یہ بھی وہم کا ہے کہ اسی تخلص کے کئی شاعر گزرے ہیں جنھیں ممکن ہے کہ ہمارے غلط نویس تذکرہ نویسوں نے نظامی گنجوی سمجھا ہو۔ پھر کہتے ہیں کہ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ نظامی کا کوئی دیوان تھا تو یہ بھی صحیح ہے کہ وہ مدت مدید سے بالکل معدوم اور نایاب ہے۔

یہ صحیح ہے کہ دولت شاہ جس کے یہاں سے متقدمین میں نظامی کے دیوان کی موجودگی ثابت ہوتی ہے غیر محتاط ہے مگر یہ خیال کرنا کہ ایسا نہ ہو نظامی عروضی کا دیوان انکے نام سے موسوم ہو گیا ہو۔ سخت غلطی ہے۔ نظامی عروضی کا کلام ہرگز نظامی سے مماثل نہ تھا۔ چنانچہ بعض لوگوں نے غلطی سے مثنوی ویسہ و رامین کو مولانا نظامی سے منسوب کر دیا ہے۔ اور ہرگز باور نہیں کرتے کہ یہ کلام اوس نظامی کا ہو سکتا ہے جس نے سکندرنامہ کہا ہو، لطف علی آذر آتشکدہ میں لکھتے ہیں :-

"مثنوی حکایت ویسہ و رامین را بعضے بہ شیخ نسبت و بعضے بہ نظامی عروضی نسبت میدہند و بہ زعم فقیر اگر از منظومات جناب شیخ باشد در اوایل حال کے کلام ہنوز بختگی بہم نرسانیدہ بود گفتہ بہر حال نظر بہ خمسہ شیخ را احتیاطی باں نسبت۔"

جب یہ حال ہے تو کیونکر ممکن ہے کہ پورا دیوان ان سے منسوب ہو گیا ہو۔ یہ ایک نظری غلطی ہے۔ جس کا ثبوت خود کلام کو معائنہ سے ہو سکتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ کوئی تذکرہ نویس اونکے دیوان کا دیکھنا بیان نہیں کرتا۔ مگر اسکے یہ معنے نہیں ہیں کہ اُنکا دیوان ہی

نہ تھا۔ چنانچہ حال ہی میں معارف کے فروری ۱۹۳۶ء نمبر میں جناب قاضی اختر میاں جوناگڈھی نے اس جملہ کی تردید میں ایک زبردست محققانہ مضمون لکھا تھا جس میں سے اکثر باتیں ہم نے بھی اپنے مضمون میں استدلالاً پیش کی ہیں اور انھوں نے فرمایا ہے کہ ہندوستان میں کوئی نسخہ دیوان نظامی کا موجود نہیں۔ البتہ آغا احمد علی کے پاس اس کا ایک قلمی نسخہ موجود تھا جسکی نسبت وہ فرماتے ہیں۔

"نزد بندہ احمد یک موجز دیوان شیخ نظامی گنجوی محتوی بر قصائد و غزلیات و رباعیات عارفانہ کہ تخمیناً بگی پانصد بیت خواہد بود موجود است و کتابخانہ ام راازو شرفی نامحدود۔"

اسکے علاوہ قاضی صاحب موصوف پروفیسر ہوٹسما کے تین نسخہ نظامی کے دریافت کرنیکی بابت بھی لکھتے ہیں۔ جس میں سے دو اکسفورڈ کی بوڈلین لائبریری میں موجود ہیں۔ اور تیسرا نسخہ ڈاکٹر اسپرنگر کے ذخیرہ کتب میں ہے جو اسوقت برلن کی پروشین نیشنل لائبریری میں موجود ہے۔

ان سب بیانات سے بھی پروفیسر براؤن کے قول کی تردید ہوتی تھی اور یوں بھی کہ اسوقت نظامی کا دیوان خود ہمارے سامنے موجود ہے۔ یہ نسخہ نولکشور پریس کے کتب خانہ میں موجود ہے اسکے آخر دیوان میں یہ عبارت درج ہے۔

"دیوان حضرت اولیائے نظامی گنجوی قدس اللہ سرہ در دارالخلافت شاہجہاں آباد بہ اشتیاق تمام بہ سرعت بتاریخ دوازدہم ماہ اگست ۱۸۳۵ء روز دوشنبہ بخط پنڈت دہرم نرائن اختتام پذیرفت۔"

اس نسخہ میں ۲۰۳ صفحات ہیں۔ اشعار کی مجموعی تعداد مصنف ہفت اقلیم کے دیوان سے بہت زیادہ یعنے نوسو پچاس ہے جس میں دس قصیدے اکیسو چھ غزلیں چار قطعے اور سینتیس رباعیاں شامل ہیں۔ خط نہایت پختہ ہے۔ مگر افسوس ہے کہ کاتب نے یا تو عجلت کی وجہ سے نہایت ہی جلدی میں لکھا ہے یا غلطیاں جو رہ گئی ہیں۔ وہ منقول منہ کی خرابی کی وجہ سے ہیں۔ مطبع نولکشور کا کتب قدیم کے بارہ میں جو رویہ رہا ہے وہ ظاہر ہے۔ سینکڑوں ایسی ایسی نادر الوجود کتابیں طبع کی ہیں کہ اگر طبع نہ کیجاتیں تو آج انکا کہیں بھی نشان نہ ملتا۔ اس لئے اپنے علومہت سے مطبع کا خیال ہے کہ اس نایاب کتاب کو بھی شائع کیا جائے۔ مگر چونکہ اس میں غلطیاں ہیں۔ اور دوسرا کوئی نسخہ موجود نہیں ہے اسواسطے سخت دقتیں لاحق ہو رہی ہیں۔ امید ہے کہ وہ حضرات جن کے پاس کوئی قلمی نسخہ دیوان نظامی موجود ہو اُس سے مطلع فرمائیں گے اور عاریتاً یا جسطرح ممکن ہو مرحمت فرمائیں گے۔ تعداد اشعار وغیرہ کو دیکھکر یہ نسخہ سب سے مختلف معلوم ہوتا ہے۔ مگر اسمیں کوئی شک نہیں کہ یہی اصل دیوان نظامی ہے۔ کیونکہ اسمیں تمام وہ اشعار موجود ہیں جو مولانا نظامی کے نام سے منسوب کئے جاتے ہیں۔

آخر میں ہم اس دیوان کے چند اشعار منتخب کرکے بتانا چاہتے ہیں کہ نظامی تغزل کے رنگ میں کس درجہ بلند تھے۔

با تو پدید می کنم حال تباہ خویش را	تا تو فضیحتے کنی چشم سیاہ خویش را
چوں ز نقاب بر کشی روئے چو ماہ خویش را	عرضہ کنند عاشقاں حال تباہ خویش را

سفرے بسوئے ما کن گذرے بکوئے ما کن ۔۔۔ نظرے بروئے ما کن ز برائے روز فردا
ز غمت چو من ہزاراں بچنیں بلا و خواری ۔۔۔ اگرم فرو گذاری من و کوہ و دشت صحرا

اے دیدہ ترا بما نظر نیست ۔۔۔ اے عقل ترا بما گزر نیست
از دیدہ و عقل تا چہ گوئیم ۔۔۔ کاں رفت ز دست وزاں اثر نیست
راضی نہ شود بہ دیں قدر نیز ۔۔۔ جاں دادن اگرچہ مختصر نیست
بردار نظامیا دل و جاں ۔۔۔ کایں جائے سکونت و مقر نیست

ہر آں کش راچنیں معشوق باشد ۔۔۔ بہر دو عالمش خلوت مہیا است

اے پیک خجستہ یار چون است ۔۔۔ من بیدلم آں نگار چون است
من بر سر آتشم شب و روز ۔۔۔ آں نرگس آبدار چون است
اندر ہمہ عمر خود نہ پرسید ۔۔۔ کاں شیفتہ را قرار چون است

تا بہ پیل ساگی زاہد پنہاں شدم ۔۔۔ زاہد پدید اکنوں کافر نہانی است

بر ہمہ خستہ دلاں دادگری کردہ ۔۔۔ چوں بہ نظامی رسید قصد دگرگوں چرا است

رہ میخانہ و مسجد کدام است ۔۔۔ کہ ہر دو بر من مسکیں حرام است

کردم سوالہا بامید از دہانِ تو ۔۔۔ معذوری اے نگار کہ جائے جواب نیست
گفتی نظامیا ز غمت عافیت مباد ۔۔۔ دل شاد میزیم کہ دعا مستجاب نیست

عاشقاں خوروند مے واں مفلساں گشتند مست ۔۔۔ باش تا روز پسیں نوبت بہ ہشیاراں رسد

عمرے زجہاں قسمت من بے جگری بود   دیں آرزوئے عشق توام خیرہ سری بود
تو نیز دلم بردی و در پردہ نشستی   مقصود تو ازیں پردہ ہمیں پردہ دری بود

نام لبش شنیدہ ام خرقہ ازاں دریدہ ام   بادہ ناچشیدہ ہیں تا چہ خمار میکند

ہمہ جہاں ز تو در عافیت گناہم چیست   کہ از تو بر سر ما جز بلائی آید

داد منِ غم کشتۂ مسکیں بدہ از وصل   زاں پیش کہ ایں قصہ بہر انجمن افتد

بچشمہائے عزیزت نمی توانم گفت   کہ بے تو عمر عزیزم چہ خوار می گردد
سرکشی میکن کہ بارت می کشم   وز دل صافی غبارت می کشم
روزگارم می کشد در جور تو   جور او از روزگارت می کشم
مستم از عشقت کہ روشن بادہ است   لاجرم رنج خمارت می کشم

تدبیر کنم ہر شب تا دل ز تو برگیرم   چوں روز فرود آید مہر تو ز سر گیرم
پیش ازیں افتادہ ام در عشق خوباں چند بار   بر من مسکیں نگریں بارزار افتادہ ام
گفتی نظامیا بغم من صبور باش   در من کجاست صبر مگر از زبان تو
ہر جا کہ غمے بینی خواہی ز برائے من   ہر جا کہ دلے بینم خواہم ز برائے تو

از دستِ فراق تو کسے زندہ نماندہ است   پس بازچہ پرسیم کہ چونی و کجائی
اندر طلب عشق تو بودہ است نظامی   منغش مکن اے دوست کہ کاریست قضائی

آسی

زخمِ عشق

مدرسہ کے طلباء روز شام کو واپسی کے وقت جبار کے باغ میں جاتے وہاں انکے کھیل کود اور ہر قسم کی دلچسپیوں کے کافی اسباب موجود تھے۔ یہ باغ نہایت وسیع، سرسبز اور شاداب تھا۔ اس کے دلکش اور دلفریب مناظر آنکھوں کو سرور اور دل کو فرحت وبہجت سے معمور کردیتے۔ زمین پر سبز پودوں کی مخملی چادر بچھی تھی جس میں رنگ برنگ کے پھول پتے جڑے تھے اس باغ میں چند عالیشان مکانات تھے جن کے درمیان شفتالو کے درخت تھے۔ جو بہار میں خوشنما کلیوں اور خزاں میں عمدہ اور لذیذ میوے سے لدے رہتے۔ درختوں پر ہر وقت چڑیوں کے چہچہے باغ کی رونق اور دلفریبی میں اور اضافہ کردیتے۔ یہ چڑیاں دن بھر مصروف نغمہ وسرود رہتیں۔ درخت کی ڈالیاں ہوا کے جھونکوں سے اسطرح جھومتیں گویا چڑیوں کی نغمہ طرازیوں پر تالیاں بجارہی ہیں۔ لڑکے بھی یہ دلفریب منظر دیکھ کر بیخود ہوجاتے اور حالت طرب میں ہر طرف چھلانگیں مارتے اور ایک دوسرے سے خوش خوش کہتے کہ ہمارے کھیل کود کے لئے کیسا اچھا مقام ہے۔

اسی باغ کا مالک جبار تھا جو اپنی ضرورت سے کچھ دنوں کے لئے باہر چلا گیا تھا۔ اسکی عدم موجودگی میں لڑکوں کو پوری آزادی حاصل تھی۔ وہ ہر روز شام کو آتے اور بخوف وخطر باغ کی سیر کرتے، اس کے مناظر سے لطف اندوز ہوتے اور دلپسند گیت گاگا کر دل خوش کرتے۔ جبار سفر سے واپس آیا اور لڑکوں کو باغ میں کھیلتے دیکھکر غصہ سے بھر گیا اُس نے چیخ کر کرخت لہجہ میں کہا کہ تم لوگ یہاں کیا کرتے ہو۔ لڑکے یہ سخت آواز سُن کر سہم گئے اور سب نے بدحواسی کے عالم میں اپنا اپنا راستہ پکڑا، تھوڑے ہی دور گئے ہونگے کہ انکے کانوں نے ویسی ہی کرخت آواز سُنی کہ "کیا تم جانتے نہیں کہ یہ میرا باغ ہے۔ اسمیں ہرگز کسی کو قدم رکھنے کی اجازت نہیں۔

چند ہی روز بعد اس نے باغ کے اردگرد ایک مضبوط حصار تعمیر کرادیا اور دروازہ پر لکھدیا کہ "ہرگز کسی کو باغ میں قدم رکھنے کی اجازت نہیں۔ اسکی خلاف ورزی کرنے پر وہ مورد عتاب ہوگا"

جبار اپنی خودبینی اور خودنمائی سنگدلی اور بے مروتی میں ضرب المثل تھا، اوسکا دل مخلوق کے رحم ومحبت سے بالکل خالی تھا اب اسکے بعد لڑکے کھیل کود سے بھی محروم ہوگئے۔

بارہا اُنھوں نے ارادہ کیا کہ وہ راستہ یا سڑک پر اپنے کھیل جاری رکھیں، لیکن راستہ کی ناہمواری، ڈھیلوں اور کنکروں کی کثرت اور گرد وغبار انکے اس شوق میں سخت مزاحم تھے۔ وہ ہر روز مدرسہ سے واپسی کے وقت حصار کے

اور گرد حسرت بھری نگاہیں ڈالتے ہوئے پھرتے اور گذشتہ آزادی کا تذکرہ نہایت غم و افسردگی سے کرتے۔

جاڑے کا زمانہ ختم ہو رہا ہے، چڑیوں کے نغمے، درختوں کی شادابی، کلیوں کا دلفریب تبسم ہر طرف فصل بہار کی آمد آمد کی خوشخبری دے رہا ہے۔ لیکن جبار کے باغ پر ابھی وہی ویرانی اور وہی خزاں بدستور مسلط ہے کیونکہ باغ میں لڑکے نہیں ہیں۔ درخت کی شاداب شاخیں بھی خشک ہو رہی ہیں۔ پتوں اور کلیوں کا کہیں وجود نہیں۔ ایک خوبصورت کلی نے شگوفہ سے سر نکالا۔ لیکن دروازے کا اعلان پڑھکر لڑکوں کی محرومی اور حالتِ زار پر متاسف ہوئی۔ اور پھر منھ ڈھانپکر سو گئی۔

برف اور کہر کو بہار کے نہ آنیکی بڑی خوشی تھی۔ وہ خوش ہو ہو کر ایک دوسرے سے کہتیں کہ بہار اس باغ میں آنا بھول گئی اچھا ہوا مزے سے سال بھر ہمارا اسی باغ پر تسلط رہے گا۔

برف نے آرام سے اپنی سفید چادر تان دی اور درختوں کی شاخوں کو ڈھک لیا۔ اس خوشی میں بادِ صرصر کو بھی دعوت دی۔ اُس نے انکی دعوت قبول کی اور اپنی تباہ کن تیزی اور برودت کے ساتھ مسلسل گھنٹوں تک باغ پر مسلط رہی۔ برف اور کُہر کی دعوت پر بدلی نے بھی مسلسل تین روز اپنے دل کا بخار نکالا۔ پانی کی کثرت سے مکانوں کی دیواریں ہل گئیں۔ کھڑکیوں کے اکثر شیشے ٹوٹ ٹوٹ کر گر گئے۔ غرض بادِ صرصر کی ستم رانیوں سے جو ذخیرہ بچ رہا تھا وہ موسلا دھار بارش کی نظر ہو گیا۔

جبار کو آٹھ پہر فصلِ بہار کے انتظار میں گذرتے۔ ایک روز وہ حالت اضطراب میں اُٹھا اور کھڑکی کے سامنے کھڑے ہو کر باغ پر ایک پُرحسرت نگاہ ڈالی۔ دیکھا کہ ہر طرف خزاں اور برف کا دور دورہ ہے۔ اُسکی زبان سے بے اختیار نکلا "سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سال بہار کہاں غائب ہو گئی" اُس نے اپنے دل کو تسلی دیتے ہوئے کہا "اب آنا ہی چاہتی ہے، اے باغ صبر کر کیونکہ ہر خزاں کے بعد بہار اور ہر تکلیف کے بعد آسائش ہے" لیکن بہار کو نہ آنا تھا نہ آئی۔ عالم کے گوشہ گوشہ میں بہار آچکی تھی۔ درخت پتوں اور پھلوں سے آراستہ ہو چکے تھے، لیکن جبار کا ایک اکیلا باغ تھا جسکو بہار نے اپنی نظرِ کرم کا مستحق نہ سمجھا، کیونکہ جبار تند مزاج اور سنگ دل تھا۔ جاڑا اپنے پورے ساز و سامان، برف، ٹھنڈ، بدلی اور ہوا کی تیزی کے ساتھ بدستور قائم رہا۔

ایک روز صبح کے وقت جبکہ جبار اپنی چارپائی پر غنودگی کے عالم میں پڑا ہوا تھا، اُسکے کانوں میں ایک دلکش اور سُریلی آواز آئی۔ جبار سمجھا شاید باغ کے کنارے سے گانیوالوں کا کوئی طائفہ گذر رہا ہے۔ لیکن یہ آواز گانے کی آواز نہ تھی، ایک چڑیا کی آواز تھی جو باہر ایک شاخ پر بیٹھی ہوئی گا رہی تھی۔ اب جاڑا ابھی رخصت ہو گیا، ہوا کی رفتار معتدل ہو گئی اور سارا مکان بھینی بھینی خوشبو سے معمور ہو گیا۔ جبار جلدی سے بستر سے اُٹھا اور کھڑکی سے سر باہر نکالا کہ "اب بہار ضرور آگئی ہے" لیکن اس نے اپنے سامنے ایک عجیب و غریب منظر دیکھا، جس کا اسے کبھی گمان تک نہ تھا۔ لڑکے جو باغ سے لطف اندوز ہونے کے لئے بیتاب تھے۔ ان سے رہا نہ گیا اور انھوں نے جبار دیواری کے ایک کمزور حصہ میں

نقب لگائی اور اندر داخل ہو کر باغ میں چھپ گئے۔ جبّار کی نظر جس درخت پر پڑتی اُسکے نیچے ایک لڑکا نظر آتا۔

اُس نے دیکھا کہ باغ کے مکانات جوشِ محبت میں لڑکوں پر جھک پڑے ہیں۔ کلیاں شوق میں بیتابانہ باہر نکل آئی ہیں۔ درخت کی نرم شاخیں ان معصوم بچوں کو پیار کرنے کے لئے جھک پڑی ہیں۔ چڑیاں نیچے کی شاخوں پر عالم بیخودی میں نغمہ سنج ہیں۔ لیکن ابھی تک باغ کا ایک گوشہ بدستور برف، ٹھنڈا اور خزاں کا شکار بنا ہوا ہے، اُسمیں ایک ننھا بچہ روتا اور شور کرتا ہے وہ درخت پر چڑھنے کے لئے اپنے ننھے ننھے ہاتھ اُٹھاتا ہے۔ لیکن چڑھ نہیں سکتا۔ درخت بھی برف سے ڈھکا ہوا ہے۔ اور اُس پر تیز ہوا چل رہی ہے۔ درخت کو ترس آیا اُس نے اپنی شاخیں جھکا دیں اور لڑکے سے نہایت ترنم ریز لہجہ میں کہا۔ آ! آ! اے پیارے بچے آجا۔ میری گود میں آجا۔ لڑکے نے پھر اپنے ننھے ہاتھ اوپر کئے اور شاخیں پکڑنے کا ارادہ کیا لیکن پہونچ نہ سکا۔

جبّار دور سے کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا اوسکا دل نرم ہو گیا۔ اسکے دل میں رحم و محبت کا جذبہ موجیں لینے لگا اُس نے کہا میں کتنا سخت اور سنگ دل ہوں میں کتنا مغرور اور خود بیں ہوں۔ آج مجھے بہار کی تاخیر کا سبب معلوم ہوا افسوس میں نے اپنی ساری عمر گناہوں میں بسر کی۔ مجھے اب اسکا کفارہ ادا کرنا ہوگا۔ میں جاؤں اور معصوم بچے کو درخت پر چڑھا دوں۔ چہار دیواری بھی منہدم کرادوں اور باغ کو بچوں کے لئے وقف کردوں وہ اسمیں جو چاہیں کریں۔ دل میں یہ باتیں کیں اور مکان سے نکلکر تیزی سے باغ کی طرف چلا لیکن لڑکے اسے دیکھتے ہی چلائے اور بھاگ گئے اور اُنھیں کے ساتھ بہار بھی اپنی تمام رعنائیوں اور دلفریبیوں کے ساتھ رخصت ہو گئی اور کچھ دیر کیلئے پھر خزاں کا دور دورہ ہو گیا۔

باغ میں سوائے اس ایک چھوٹے لڑکے کے کوئی باقی نہیں رہا۔ اسکی آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں اسی لئے وہ جبّار کو نہ دیکھ سکا۔ جبّار تیزی سے جھپٹ کر لڑکے کے پاس پہونچا۔ اور اسکو پیار سے سینہ سے لگا لیا اور درخت پر چڑھا دیا۔ اُس کے چڑھتے ہی درخت پتوں اور کلیوں سے لد گیا اور اس کے پاس کی فضا طیور کی نغمہ طرازیوں سے معمور ہو گئی۔

لڑکوں نے جب یہ ماجرا دیکھا انکو خیال آیا کہ جبار اب اپنی شرارت اور سنگدلی سے باز آ گیا۔ سب کے سب پھر باغ میں واپس آئے اور انھیں کے ساتھ ساتھ بہار بھی اپنی سرسبزی اور چمک دمک کے ساتھ واپس آئی۔

جبار نے لڑکوں کا نہایت گرمجوشی سے استقبال کیا اور منت سماجت سے کہا کہ میرے پیارے بچو! اب یہ باغ تمہارا ہے۔ اب تمھیں کوئی روک نہیں سکتا۔ اب تم اس میں جو چاہو کرو، وہ ایک کدال لیکر اُٹھا اور چہار دیواری بھی منہدم کرادی۔

راہرو باغ کے کنارے کے راستہ سے گذرتے اور اس ناگہانی انقلاب پر حیرت زدہ ہو جاتے۔ چہار دیواری اب منہدم تھی۔ جبار لڑکوں میں ٹہل رہا تھا اور اس کا رشکِ فردوس باغ بچوں کی حکومت میں تھا۔ لوگ باغ کا منظر دیکھتے اور مبہوت ہو جاتے۔ اس سے پہلے انکو باغ کی سرسبزی، شادابی، رونق اور دلکشی کے اعتبار سے عدیم النظیر ہونے کا

اقرار تھا لیکن اب انھیں نظر آیا کہ چھوٹے بچوں کی وجہ سے جو تازہ حسن و جمال اسمیں ہے اس سے پہلے کبھی نہ تھا۔

آج لڑکوں کی تعطیل کا دن تھا وہ دن بھر کھیل کود میں مشغول رہے۔ شام کو گھر جانے لگے تو جبار کے پاس سلام کے لئے گئے۔ جبار کا دل اس چھوٹے بچے کی محبت سے معمور تھا ان سے دریافت کیا کہ وہ بچہ کہاں ہے؟ مجھے نظر نہیں آتا۔ سب نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا اور یک زبان ہو کر کہا کہ اس سے قبل ہم نے اسکو دیکھا بھی نہیں۔ ہم نہیں جانتے وہ کہاں کا رہنے والا تھا اور کہاں گیا۔ جبار اسکی محبت میں سرشار تھا وہ یہ سن کر پریشان ہو گیا اسکا دم گھٹنے لگا۔ زبان رک گئی۔

لڑکے روزانہ شام کو باغ میں آتے۔ انکے ساتھ جبار بھی کھیل کود میں دلچسپی لیتا اگرچہ وہ سب لڑکوں کے ساتھ لطف و مہربانی سے پیش آتا۔ لیکن اس کی آنکھیں اسی ایک کی تلاش میں بیتاب تھیں۔ اسکا دل اسی ایک کے پالینے کی تمنا رکھتا تھا دل میں کہتا (کاش اسے دیکھ لیتا) اسی اضطراب اور بے چینی میں جبار نے کئی سال بسر کئے اب وہ بوڑھا ہو چکا تھا اسکے اعضاء میں اضمحلال آگیا تھا اب اس میں پہلی سی طاقت باقی نہ تھی۔ اب وہ لڑکوں کے کھیل میں بھی شریک نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ کرسی پر بیٹھ جاتا اور انکا کھیل دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا۔ دل میں کہتا کہ اگرچہ باغ میں عمدہ عمدہ پھول۔ شاداب تختے خوشنما کلیاں اور طرح طرح کی زینت کے سامان موجود ہیں لیکن لڑکے ہر زینت سے بڑھ کر ہیں۔ بہار کا زمانہ تھا جبار سو کر اٹھا اور کپڑے بدل کر کھڑکی کے سامنے کھڑا ہو کر باغ کی سیر میں مشغول ہو گیا۔ اسوقت اس پر نشاط اور کیف کا عالم طاری تھا اسے چھوٹے سے چھوٹے رنج و الم کا بھی کھٹکا نہ تھا کیونکہ اسے یقین تھا کہ بہار کا زمانہ نشاط و شادمانی کا زمانہ ہے۔ دفعتاً اسے ایک عجیب و غریب منظر نظر آیا اسنے پریشانی کے عالم میں اپنی دونوں آنکھیں ملیں۔ اسے اسی پہلے گوشہ میں ایک درخت نظر آیا جو سفید خوبصورت کلیوں سے لدا ہوا تھا۔ اسکی نرم و نازک شاخوں پر پھل لٹک رہے تھے اور اسکا وہی کم سن محبوب درخت کے نیچے پھل چننے میں مشغول تھا اسے دیکھتے ہی جبار بجلی کی طرح ایک لمحہ میں باغ کو طے کر کے اس کے پاس پہونچا۔ اسے لڑکے کے ہاتھ اور پیر زخمی نظر آئے یہ دیکھ کر وہ بیتاب ہو گیا۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ زور سے چیخ لگائی اور کہا "یہ زخم کیسے ہیں"؟ اس نے مکرر سوال کیا یہ زخم کیسے ہیں؟ جلد بتا تاکہ اس ظالم کے خون سے دل کو تسکین دوں لڑکے نے جواب دیا "یہ زخم عشق کا زخم ہے"۔

جبار اس جواب سے تھرا اٹھا اور لڑکے کے سامنے زانو ٹیک کر پوچھا آپ کون ہیں؟ لڑکے نے ہنستے ہوئے نرم لہجہ میں جواب دیا "تم نے مجھے اپنے باغ میں کھیلنے کی اجازت دی اب میں تمہیں اپنے باغ یعنے جنت میں لیجاؤنگا"۔

شام کے وقت لڑکے باغ میں آئے۔ اور جبار کو اسی درخت کے نیچے سفید کلیوں سے ڈھکا ہوا مردہ حالت میں پایا۔　(آسکر وائلڈ)

شیر محمد اصلاحی

باب المراسلة والمناظرہ

(جناب سید جعفری صاحب - کامٹی)

آپ نے بلقیس رعنا کے خطوں کا جواب دیتے ہوئے ایسی پُر لُطف چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ شروع کیا تھا کہ اسکو دیر تک جاری رکھنے کی ضرورت تھی۔ لیکن یہ معلوم کر کے افسوس ہوا کہ اب نہ اُنکے خطوط نگار میں شائع ہونگے اور نہ آپکا جواب میں آپ کے اس فیصلہ سے متفق نہیں ہوں۔ کیونکہ جب اُنکے خطوط ایسے اُمور پر مشتمل ہوتے ہیں جنکا تعلق پبلک سے ہو سکتا ہے۔ اور صرف ذاتیات سے بحث نہیں ہوتی تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ انکو شائع نہ کیا جائے۔

میں جناب بلقیس رعنا سے بھی درخواست کرتا ہوں کہ وہ اس خیال کو ترک کر دیں اور آپ سے بھی یہی التجا ہے کہ ایسا نہ کیجئے، کیونکہ میں آپ کے ہر لفظ کو خواہ وہ کیسی ہی خلوت کا کیوں نہ ہو، ملک عام سمجھتا ہوں۔

(نگار) آپ ہی کیطرح اور بعض احباب نے بھی اس سلسلہ کو نگار میں شائع کرنیکی رائے دی ہے اور بعض نے مخالفت بھی کی ہے۔ لیکن موافق و مخالف دلیلوں میں سے کسی کو سامنے نہ رکھتے ہوئے میں دونوں جماعتوں کی خدمت میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ابھی تک ان دو خطوں کے علاوہ اور کوئی تحریر میرے پاس نہیں آئی کہ اُسکی اشاعت یا عدم اشاعت کا سوال پیدا ہوتا۔ لیکن اگر آئندہ کوئی خط موصول ہوا تو میں اُصولاً اُسکی اشاعت نہیں کر سکتا جبتک اسکا لکھنے والا اس پر راضی نہ ہو۔ میں اس باب میں نہ جناب بلقیس رعنا سے کوئی مراسلت کرنا چاہتا ہوں اور نہ اسکو "چھیڑ چھاڑ" سمجھکر لطف لینے والوں کے لئے اشاعت پر اصرار کر سکتا ہوں۔

میرا مسلک اس باب میں، بالکل وہی ہے جو فطرت کا۔ بلورات ثلجی (Snow crystals) کی تعمیر میں ہے کہ اگر ایسا ہوا تو ہوگا اُسی خصوصیت کے ساتھ، اسی تزئین و تحسین کے ساتھ ورنہ نہیں۔ یہ میں نے اس لئے کہدیا کہ وہ لوگ جنکی سنجیدگی میری اس نوع کی تحریروں کو بھی پسند نہیں کرتی، وہ اپنی جگہ مایوس ہو جائیں اور جو اس روش کو پسند کرتے ہیں وہ میری طرف سے مطمئن ہو کر اُسوقت کا انتظار کریں جب "بلقیسیات" کی یاد تازہ کرنیوالی کوئی تحریر "بغرض اشاعت" میرے پاس آ جائے۔

یہ بھی کسقدر عجیب و غریب واقعہ ہے کہ مردوں کا ایک گروہ مجھے عورت کا پرستار کہتا ہے اور برہم ہے، دوسری طرف عورتوں کی ایک جماعت مجھے بقول ایک خاتون کے "عورت بیزار" کہتی ہے اور چیں بر جبیں ہے وہ اس لئے کہ نسائیات

عرصہ تک میرا موضوع گفتگو رہا ہے اور یہ اس بنا پر کہ میں اُنکے افسانہ نگاری و غزل سرائی کو پسند نہیں کرتا۔ حالانکہ حقیقت اس زیادہ نہیں کہ میں انسان ہوں اور اُن تمام "کمزوریوں اور قوتوں" کے ساتھ، جو ایک انسان میں پائی جاتی ہیں، اگر میں عورت کے ذکر پر بے قابو ہو جاتا ہوں، تو زیادہ سے زیادہ آپ اُسکو میرے احساس کی قوت کہہ سکتے ہیں اور اگر میں اُن کے "عشقیات" کی عریانی کو پسند نہیں کرتا تو اس کو میری "اخلاقی کمزوری" کہئیے کہ اسطرح اُنکے حدود نسائیت سے گذر جانیکا مخالف ہوں

بہرحال جو سبب بھی ہو، اس کیفیت سے میں ناخوش نہیں ہوں، بلکہ اسوقت سے ڈرتا ہوں جب جماعت اول کی "خوشی" مجھے صرف "تہجد گزار" بنا کر میرے خواب صباحی کی شیرینی کو مجھ سے چھین لے اور جماعت ثانی کی موافقت مجھے اخلاق کے اس درجۂ انحطاط پر پہونچا دے جہاں انسانیت نام "عمرانیت" کا نہیں بلکہ "حیوانیت" کا ہے۔

(جناب محمد ذکی صاحب۔ لاہوری گیٹ امرتسر)

دنیا آپ کی کتنی ہی مخالف کیوں نہ ہو، لیکن ایک وقت آئیگا جب آپ کے خیالات کی قدر کیجائیگی اور لوگ سمجھیں گے کہ حقیقت وہی ہے جو آپ کہہ رہے ہیں۔ لیکن معاف فرمائیے اگر میں آپ کی اس کمزوری کا ذکر کروں جس نے آپ کو ایک جگہ پاؤں توڑکر بیٹھ جانے پر مجبور کیا ہے اور آپ کو مختلف مقامات پر جا کر اپنے مشن کی تبلیغ سے، باز رکھا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ زمانہ میں ہمیشہ ہر مصلح کی مخالفت ہوئی ہے، لیکن یہ بھی واقعہ ہے، کہ کبھی کسی مصلح نے مخالفت کی پرواہ نہیں کی۔ اس لئے میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ تحریروں کے علاوہ تقریروں سے بھی آپ اپنے خیالات کی اشاعت کیجئے اور یہ غالباً آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہونگے کہ

وقت آں نیست کہ در خانہ نشینی بیکار

(نگار) آپ کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ وہ وقت دور نہیں جب "می گویم و بعد از من گویند بدستانہا" کی عام کیفیت زمانہ میں پیدا ہو جائے گی، اور جس تیزی کے ساتھ انسانی ذہنیت میں انقلاب رونما ہو رہا ہے وہ ممکن ہے کہ ہماری آپکی زندگی ہی میں اس حقیقی شرف و امتیاز کو قائم کر دے جس پر ایک انسان فخر کر سکتا ہے، لیکن آپ کا مجھے مصلح کے لقب سے یاد کرنا، حقیقتاً غلط تعبیر ہے۔ مجھ میں مطلقاً اسکی صلاحیت نہیں ہے اور نہ یہ "کار عظیم" میرے بس کا ہے۔ اس میں کوئی مولویانہ یا شاعرانہ "انکسار غرور آمیز" شامل نہیں ہے۔ بلکہ بالکل حقیقت و واقعیت کا اظہار ہے۔

میں جو کچھ کہتا ہوں وہ میرے دل کی بے ساختہ پکار ہے، میری روح کی دردمندیوں کی ناقابل ضبط فریاد ہے جس کو زیادہ سے زیادہ "درماں طلبی" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، میں خود جستجو کی منزل سے باہر نہیں نکلا، دوسروں کے لئے دلیل راہ کیا بن سکتا ہوں، میں بہت درماندہ و عاجز ہوں، بہت بے مایہ و کمزور ہوں۔ اور یہ غالباً آپ کو بھی معلوم ہوگا۔

کہ سلطاں نخواہد خراج از خراب

پھر آپ کے مطالبہ کو میں کیونکر پورا کر سکتا ہوں اور کس طرح مجھ میں وہ مصلحانہ جرات پیدا ہو سکتی ہے جس کا ذکر آپ نے اپنی تحریر میں کیا ہے۔

میرے حالات کا اقتضا نہیں ہے کہ میں مختلف مقامات میں جا کر اپنی آواز لوگوں تک پہونچاؤں۔ ممکن ہے اس کا سبب یہ بھی ہو کہ مجھ میں وہ "جرأت رندانہ" نہیں ہے جو "فکر فضول" کے ساتھ مل کر ایک انسان کو کامیاب بنا سکتی ہے لیکن میرے نزدیک اسکی بڑی وجہ وہی ہے جسے میخواروں کی اصطلاح میں "نارسائی بادہ" کہتے ہیں۔ یہ تو ہوا حقیقت کا اظہار۔ لیکن اگر میں شاعری کرنے پر آؤں تو کہہ سکتا ہوں کہ اگر آپ کے نزدیک وہ وقت نہیں ہے کہ "درخانہ نشینی بیکار" تو میرے نزدیک یہ ترین مصلحت نہیں ہے کہ "از پردہ بروں افتد زار" فی الحال خاموش رہیئے، جس وقت میں مصلحانہ ادعا، مہدیانہ دعوت اور پیغمبرانہ عزم کے ساتھ اٹھوں گا تو پنجاب کے حواریین کی فہرست میں سب سے پہلا نام آپ کا ہوگا۔

فلسفۂ مذہب

اگر آپ نے ابھی طلب نہیں فرمائی تو اب منگوا لیجیے۔ مولوی سید مقبول احمد بی۔ اے کے تمام وہ مضامین جو "نگار" میں ڈیڑھ سال تک اس عنوان سے نکلتے رہے ہیں۔ اور جنھوں نے ملک میں ایک ہنگامہ بپا کر دیا تھا۔ اب کتابی صورت میں یکجا شائع کر دئے گئے ہیں، مذہب کے متعلق اگر آپ اپنی معلومات وسیع کرنا چاہتے ہیں تو اس کو ضرور پڑھیے۔ قیمت مع محصولڈاک ایک روپیہ چار آنہ (عہ)

منیجر نگار لکھنؤ

باب الاستفسار

سندھ میں عربی حکومت کا نشو و زوال

عہد بابر سے قبل تاریخ ہند کا ماخذ

اور

مقام قندابار کی تعیین

(جناب سید اکبر حسین صاحب۔ شاہ گنج۔ الہ آباد)

میں آجکل تاریخ ہند کا مطالعہ کر رہا ہوں اور بعض مسائل میں آپ کی رہبری کا طالب ہوں۔ بہ لحاظ اختصار میں اپنے سوالات کی تعیین علیحدہ علیحدہ کئے دیتا ہوں۔

(۱) سندھ میں عربی حکومت کا آغاز کیونکر ہوا۔ اس کے مدارج ترقی کیا تھے اور زوال کیونکر ہوا؟

(۲) حقیقی معنی میں اسلامی حکومت ہند کب سے شروع ہوئی۔

(۳) اگر کوئی شخص حملۂ بابر سے قبل تاریخ ہند کا مطالعہ اصلی ماخذوں سے کرنا چاہے تو اُسے کن کتابوں سے استفادہ کرنا چاہیئے اور ان کتابوں کی تاریخی اہمیت کیا ہے؟

(۴) سندھ کی ابتدائی فتوحات میں ایک مقام قندابار کا بھی ذکر آتا ہے۔ کیا اس سے مراد موجودہ قندہار ہے؟

(نگار) ہرچند آج کل مجھے وہ سکون و دلجمعی میسر نہیں ہے، جو آپ کے اس اہم مجموعۂ "استفسارات" کا جواب دینے کے لئے حاصل ہونا چاہیئے، تاہم کوشش کرونگا کہ اس حالت بے اطمینانی میں بھی کسی حد تک آپکو مطمئن کر سکوں۔

رحلت نبوی کے بعد بیس سال کے اندر اہل عرب نے جس تیزی کے ساتھ، شام و فلسطین، مصر و ایران کو زیر کر کے حکومت اسلام وہاں قائم کر دی، اس سے تاریخ کا ہر طالب علم آگاہ ہے۔ ہر چند ہمارے موضوع سے یہ بحث بالکل جدا ہے کہ وہ کیا اسباب تھے جنھوں نے عرب کے وحشیوں میں یہ شاہانہ عزم پیدا کیا اور وہ کیا انقلاب ذہنی تھا جس نے پست و جاہل قوم کو، اسقدر زبردست ولولۂ عمل سے لبریز کر دیا۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ جب پہلی صدی ہجری میں، اہل عرب تمام قدیم دنیا میں منتشر ہو گئے تو اُنھوں نے اپنے مقبوضات وسیع کرنے میں کوئی دقیقہ کوشش کا اٹھا نہیں رکھا اور اُسوقت تک وہ اپنے فاتحانہ اقدام سے باز نہیں آئے، جبتک خود فطرت نے ان کے سامنے ناقابل تسخیر حجابات پیدا نہیں کر دیئے۔ وہ شمالی افریقہ میں پھیل گئے اور کون کہہ سکتا ہے کہ وہ کہاں جاکر ٹہرتے اگر خشک و گرم ریگستان ان کے سامنے حائل نہ ہو جاتا، اسی طرح اُنھوں نے جب ہسپانیہ کو زیر نگیں کیا تو اپنی حدود سلطنت وسیع کرنے کے لئے اسوقت تک برابر مضطرب رہے، جبتک بحر اٹلانٹک کی موجوں نے انکے سامنے خط فاصل نہیں کھینچ دیا۔ بالکل یہی صورت مشرق میں پیش آئی کہ وہ فارس کو فتح کر کے آگے بڑھے اور اگر ہندو کش کی برف پوش سنگین دیواریں سامنے نہ ہوتیں تو سرزمین ہند تک ان کا پہونچ جانا یقینی امر تھا۔

ہر چند اہل عرب ان دولتوں سے آگاہ نہ تھے، جن سے سمندر کی گہرائیاں مالامال ہیں، تاہم وہ مغربی ہند کے سواحل سے بیخبر نہ تھے، جہاں زمانۂ قدیم سے عرب تاجروں کی آمد و رفت پائی جاتی تھی۔ یہ لوگ خلیج فارس کو عبور کر کے دریائے سندھ کے دہانہ تک اور وہاں سے سپرا، کمبایت اور کبھی کبھی کالی کٹ اور ساحل مالابار کی بندرگاہوں تک پہونچ جاتے تھے۔

اس سے مدعا یہ ہے کہ اہل عرب ہندوستان سے ناواقف نہ تھے اور تجارتی تعلق ان دونوں ملکوں کے درمیان پہلے سے قائم تھا۔ جس میں کوئی ملوکانہ اقدام شامل نہ تھا۔ سب سے پہلی فوجی مہم ساحل ہند پر ۱۵ھ میں خلیفۂ ثانی کے زمانہ میں روانہ کی گئی، جو بمبئی کے قریب تھانہ[۵۱] پر قابض ہو کر بھروچ[۵۲] تک پہونچ گئی تھی۔

چونکہ خلیفۂ دوم اسکو پسند نہ کرتے تھے کہ اہل عرب اپنے ملک سے بہت دور رہکر وہیں کے ہو جائیں اس لئے اُنھوں نے بحری تاختوں کو ممنوع قرار دیا اور تھانہ و بھروچ کی یہ مہم بے مقصد ہو کر رہ گئی۔

خلیفۂ ثالث (عثمان غنی) کے زمانہ میں حکیم بن جبلہ ہند و سندھ کا حال دریافت کرنے کیلئے مامور کئے گئے، لیکن انھوں نے ایسے مایوس کن حالات بیان کئے کہ اسطرف بڑہنے کا خیال ترک کر دیا گیا۔

عہد خلیفۂ چہارم (جناب امیرؑ) میں البتہ ایک مہم آخر ۳۸ھ میں روانہ کی گئی جو کوہ قیقان[۵۳] تک پہونچی اور حارث بن مرہ

---

۵۱ بلاذری نے اس مقام کا نام تانہ لکھا ہے۔

۵۲ معجم البلدان میں بھروچ کو بروج اور بردص لکھا ہے۔

۵۳ بلاذری کی تحقیق ہے کہ قیقان سندھ کے ایک پہاڑ کا نام ہے۔

افسر فوج تھے۔ لیکن اُسی وقت حضرت علیؑ کی شہادت وقوع میں آئی اور اس مہم کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

امیر معاویہ کے عہد میں سب سے پہلے مہلب نے سندھ پر حملہ کیا اور پھر عبد اللہ ابن عامر نے مکران پر مسلمانوں کا قبضہ اسی زمانہ میں ہوا۔ یزید اور معاویہ ثانی کے عہد میں بھی مسلسل کئی بار حدود ہند پر حملہ کیا گیا۔ اور مروان کے زمانہ میں چیتانہ پر بھی حملہ ہوا۔ جس میں حسب بیان کرنل کاڈ (راجستھان) اجمیر کا راجہ معہ اپنے بیٹے کے مارا گیا۔

جب مروان کے بعد عبد الملک تخت نشیں ہوا اور عراق کی گورنری حجاج بن یوسف کے سپرد کی گئی تو اُس نے یکے بعد دیگرے دو افسر حملۂ ہندوستان کے لئے متعین کئے، لیکن جب وہ کامیاب نہ ہوئے تو محمدؐ قاسم کا انتخاب کیا گیا۔

محمدؐ قاسم کے حملہ سندھ کا افسانہ حقیقتاً ایک تاریخی رومان ہے۔ ہندوستان کی حالت یہ تھی کہ اُسوقت تک عربوں کا گزر یہاں بہت کم ہوا تھا، آبادی سخت جنگجو تھی، اور اُس کے اخلاق و اطوار عقائد و خصائل عربوں کے بالکل منافی تھے۔ مرکز خلافت اور ہندوستان کے درمیان کوہستانوں، دریاؤں، اور صحراؤں کا غیر متناہی سلسلہ حائل تھا، لیکن ان دشواریوں کی مطلقاً پرواہ نہیں کی گئی، اور ایک نوجوان عرب کو جس کی عمر ابھی صرف سترہ سال کی تھی اور جس کو نبرد آزمائی کا بھی کوئی خاص تجربہ حاصل نہ تھا۔ اس اہم خدمت پر مامور کر دیا گیا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ محمدؐ قاسم ہی پہلا شخص تھا جس نے صحیح معنی میں لوائے حکومت سرزمین ہند میں بلند کیا۔

ولید کے انتقال کے بعد جب سلیمان تخت نشین ہوا تو محمدؐ قاسم معزول کر دیا گیا اور اُسکی جگہ ایک شخص یزید مامور کیا گیا۔ لیکن یہ سندھ پہونچتے ہی مر گیا اور اس کے بجائے حبیب ابن مہلب بھیجا گیا۔ جس نے مقامی راجاؤں سے جنگ جاری رکھی۔ سلیمان کے بعد عمرو بن عبد العزیز تخت نشین ہوئے۔ ان کے زمانہ میں راجہ داہر کا بیٹا جیسیا مسلمان ہو گیا اور عمرو بن مسلم نے جو یہاں کا گورنر تھا ہندوؤں کے متعدد صوبوں پر حملہ کئے۔

جب عمرو بن عبد العزیز کے بعد یزید کی حکومت شروع ہوئی تو جنید بن عبد الرحمان یہاں کا حاکم قرار ہوا جو خلیفہ ہشام کے زمانہ تک بحال رہا۔ اس کے بعد تمیم بن زید العتبی گورنر مقرر کیا گیا۔ یہ گورنر بڑا فیاض تھا۔ چنانچہ اس نے ایک کرور اسّی لاکھ درہم جو خزانہ سندھ میں جمع تھے لوگوں کو تقسیم کر دئے۔ اس کے بعد حکم الکلبی یہاں کا حاکم ہوا اور اسی کے زمانہ شہر محفوظہ کی تعمیر ہوئی۔ اس کا جانشین عمرو بن محمدؐ قاسم ہوا اور شہر منصورہ طیار کیا گیا۔ آخری گورنر بنو امیہ کی طرف سے یہاں منصور[۵] تھا۔

---

۵ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ منصور کو سفاح (بنو عباس کے اول خلیفہ) نے مامور کیا تھا، لیکن یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ برہمن آباد کے کھنڈروں سے جو سکّے برآمد ہوئے ہیں۔ ان میں بعض سکّے منصور کے بھی ہیں جنکے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بنو امیہ کے آخری خلیفہ مروان کی طرف سے مامور تھا۔

جب بنو عباس کا دور شروع ہوا تو خلیفۂ اول سفاح کے زمانہ میں عبدالرحمان یہاں کا گورنر بنا کر بھیجا گیا لیکن منصور نے اس کو شکست دی۔ اس کے بعد موسیٰ بن کعب بھیجا گیا اور اُس نے منصور کو مغلوب کر لیا۔

سفاح کے بعد خلیفۂ منصور کے زمانہ میں ہشام یہاں کا گورنر مقرر ہوا۔ اُس نے تمام اُن مقامات کو فتح کیا جو مسلمانوں کے اقدام میں حائل تھے۔ اُس نے ایک بیڑہ عمرو بن جمل کی سرکردگی میں بردہ[۱] روانہ کیا اور ایک لشکر مملکت ہند کی طرف جو پنجاب تک پہونچکر ملتان پر قابض ہو گیا۔ اسی زمانہ میں قنداہار بھی فتح ہوا۔ (جس کا ذکر آپ نے اپنے استفسار میں کیا ہے) قنداہار سے مراد قندھار نہیں ہے۔ بعض مستشرقین نے خلیج کمبایت کے قریب اس شہر کا واقع ہونا ظاہر کیا ہے۔ بعض نے اس کو گن بارا (بالائی حصہ سندھ کا ایک شہر) سمجھا ہے۔ حالانکہ اس کا صحیح نام کندادار ہے جو کاٹھیاوار کے ایک مقام کا نام ہے)

خلیفۂ ہارون الرشید کے عہد میں بہت جلد جلد یہاں کے گورنر تبدیل کئے گئے تاکہ وہ زیادہ عرصہ تک رہنے کی وجہ سے خودسر نہ ہو جائیں۔ اس کے بعد دوسرے خلفاء بنی عباس کے زمانہ میں بھی سلسلۂ فتوحات جاری رہا اور ساکورہ بگر، بھم پور، قیقان، قندابیل وغیرہ قبضہ میں آئے (ان تمام مقامات کی جغرافی تحقیق کہ اُنکی اصل جائے وقوع کہاں تھی اور اب انکا کیا نام ہے، اور کہاں ہیں۔ کسی دوسرے وقت پر ملتوی کرتا ہوں)

خلافت عباسیہ کا زوال المستعصم کے عہد سے شروع ہو گیا تھا جس کی تکمیل المقتدر و المعتمد کے وقت میں ہوئی۔ موخر الذکر خلیفہ کے زمانہ میں سندھ کی حکومت یعقوب بن لیث صفاری کے سپرد کی گئی۔ جس کے انتقال پر یہ حکومت ملتان اور منصورہ دو مستقل سلطنتوں میں قائم ہو گئی۔

مسعودی ۳۰۴ھ میں یہاں آیا تھا، اس لئے ان دونوں سلطنتوں کا حال مروج الذہب میں لکھا ہے کہ:۔

"ملتان کی سلطنت خراسان تک وسیع تھی اور قریش خاندان کا ایک امیر یہاں حکمراں تھا اور قنوج بھی اسی سلطنت کا ایک صوبہ تھا۔ منصورہ میں بھی ایک قریش نسل کا سردار ابوالمنذر بن عبداللہ حکمران تھا۔ ریاست منصورہ سمندر سے الور تک وسیع تھی اور اُس میں تین لاکھ گاؤں تھے۔"

خلیفۂ المطیع باللہ اور القادر باللہ کے عہد میں ابن حوقل ہندوستان آیا تھا، اُس نے اپنے چشمدید حالات ان الفاظ میں بیان کئے ہیں:۔

---

[۱] اس مقام کو بارند، باریہ بھی پڑھ سکتے ہیں۔ بیرونی نے اس کا نام بارَوَد یا بارُود لکھا ہے۔ اس سے مُراد مقام جبتوار ہے جو سرحد گجرات پر واقع ہے۔

"ملتان، منصورہ سے چھوٹا شہر ہے۔ یہاں کوئی خاص سکہ نہیں ہے۔ تاتاری اور قندھاری درہم کا رواج ہے ملتان اور منصورہ دونوں آزاد حکومتیں ہیں۔ الور[1] جو ہندوؤں کا قدیم دارالسلطنتہ تھا، اُس کی فصیل دُہری ہے اور منصورہ کی حکومت میں شامل ہے۔ سوائے ان دو سلطنتوں کے اور بھی چھوٹی چھوٹی ریاستیں پائی جاتی ہیں۔ ایک ریاست توران ہے۔ جس کا حاکم ابوالقاسم باشندہ بصرہ ہے، دوسری ریاست قصدار ہے۔ جس کا حاکم ایک عرب نژاد معین بن احمد ہے، تیسری ریاست مکران ہے۔ جس کا دارالریاست قیز ہے۔ اس کی آبادی ملتان سے نصف ہے۔ یہاں کا حاکم عیسیٰ بن معدان ہے۔ چوتھی ریاست مشکی ہے جو مکران کی سرحد پر ہے۔ منصورہ، ملتان و دیگر اضلاع میں عربی و سندھی زبان بولی جاتی ہے اور مکران میں مکرانی و فارسی۔"

ابن حوقل نے قرامطہ کا ذکر نہیں کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا اثر سندھ میں بعد کو قائم ہوا۔ ابوالفداء کا بیان ہے کہ قرامطہ کو ۳۶۲ھ و ۳۶۳ھ میں مصر کے اندر سخت شکست حاصل ہوئی۔ غالباً اس شکست کے بعد یہ جماعت سندھ کیطرف آئی۔ اور چونکہ سارا سندھ منتشر حالت میں تھا اس لئے اُنھوں نے منصورہ اور ملتان پر قبضہ کرلیا، جہاں سے اُن کو محمود غزنوی نے نکالا۔

عربوں نے جس شان کے ساتھ سندھ پر حملہ کیا اور جو نمایاں کامیابی اُنھوں نے حاصل کی، اسکا اقتضاء یہ تھا کہ یہ پیش قدمی اور زیادہ جاری رہتی، لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ صرف سندھ کے اندر ان کی حکومت قائم ہوئی اور وہ بھی تین صدی کے اندر ہی اندر رفتہ رفتہ کمزور ہو کر نیست و نابود ہو گئی۔ اس کے اسباب پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسکی بڑی وجہ قبائل عرب کا باہمی نفاق تھا۔ اگر خلیفۂ اول یا دوم کے زمانہ میں سندھ فتح ہو گیا ہوتا تو اس میں کلام نہیں کہ آج ہندوستان کی تاریخ کسی اور نہج سے مرتب کی جاتی، لیکن سندھ بنوامیہ کے عہد میں مسلمانوں کے قبضہ میں آیا جب عرب دو جماعتوں میں تقسیم ہو گیا تھا اور تمام وہ سازشیں جو ملک کو تباہ کر سکتی ہیں، آہستہ آہستہ مستحکم ہوتی جا رہی تھیں۔ اگر محمد قاسم اس قبیلہ پرستی کی بناء پر سندھ

---

[1] اس مقام کا نام مختلف طریقوں سے لکھا گیا ہے۔ مسعودی نے "الرور" لکھا ہے۔ ابن خورداذبہ "الدور" لکھتا ہے۔ اصطخری "الرور" کہتا ہے۔ ادریسی "دور"۔ اس شہر کے کھنڈر بھکر اور خیرپور کے درمیان پائے جاتے ہیں۔ اور اَلوَر کے نام سے مشہور ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام کا اصل نام "اور" تھا۔ "ا۔ل" عربی کا زائد ہے۔ اب بھی انھیں کھنڈروں سے قریب ایک قصبہ "اوری" کے نام سے موجود ہے۔ جسے اسی قدیم اَلوَر یا اَور کی یادگار سمجھنا چاہیئے۔

سے بلا کر قتل نہ کر دیا جاتا تو یقیناً اس کا سلسلۂ فتوحات چین تک پہونچ جاتا، جیسا کہ حجاج ابن یوسف کا عزم و ارادہ تھا۔ پھر اُسی کے ساتھ یہ دقت بھی تھی کہ ہر نئے خلیفہ کے اصول حکومت بالکل جدید ہوتے تھے، اور ہر جدید حکمراں کے ساتھ ساری دنیا نئی ہو جاتی تھی۔ اس لئے کبھی کوئی گورنر اطمینان و سکون کے ساتھ نہ سندھ میں حکومت کر سکا، نہ سلسلۂ فتوحات کو بڑھا سکا۔ اگر کسی نے اصلاحات شروع کیں اور آگے بڑھنے کے اسباب فراہم کئے تو بدقسمتی سے خلافت بدل گئی۔ اور اس غریب کو بھی معزول ہو جانا پڑا۔ اس کا نتیجہ رفتہ رفتہ یہ ہوا کہ عمال سندھ کا مرکز خیال بدل گیا۔ اور پایۂ تخت کے ساتھ ہمدردی نہ رہنے کی وجہ سے خود مختاری و خود سری کے جذبات پیدا ہونے لگے۔ اسی کے ساتھ چونکہ سندھ میں عرب کے مختلف قبائل آ کر آباد ہو گئے تھے۔ اس لئے جب عرب میں قبائل کے درمیان کوئی اختلاف پیدا ہوتا تھا تو یہاں کے قبائل میں بھی اختلاف شروع ہو جاتا تھا۔

عہد بنی عباس میں بیشک بعض خلفاء ایسے ہوئے کہ یہ اختلاف چند دن کے لئے انھوں نے مٹا دیا۔ لیکن جب خلیفۂ معتصم کے زمانہ میں یمنی و نزاری کی نزاع شروع ہوئی تو سندھ پھر اختلاف کا شکار ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ جب مرکز حکومت ضعیف ہو جائے گا۔ تو اُس کا اثر نزدیک و دور ملک کے ہر حصہ پر پڑے گا۔ چونکہ عہد عباسیہ میں ہارون ہی کے زمانہ سے عجمیوں کا اقتدار قائم ہو گیا تھا، اس لئے تمام اُن مقامات میں جہاں خالص عربی حکومت قائم تھی، ضعف پیدا ہونے لگا۔ یہاں تک کہ آخر کار ایک وقت وہ آیا جب خوارج، قرامطہ، ملاحدہ اور روافض نے ساری سلطنت کے شیرازہ کو درہم برہم کر دیا اور ہر جگہ حکومت کی عمارت متزلزل ہو گئی۔ چونکہ سندھ پایۂ تخت سے بہت دور واقع تھا، اور شورش پسند جماعتوں کے لئے ایک اچھی جائے پناہ بن سکتا تھا، اس لئے یہاں، خوارج و زنادقہ، ملاحدہ و علویین نے کافی قوت حاصل کر لی اور تمام کران و سندھ میں پھیل کر سلطنت کو تباہ و برباد کر دیا، چنانچہ اب بھی سندھ میں بہت سے خاندان سیدوں کے ایسے پائے جاتے ہیں۔ جو اُنھیں علویین کی اولاد میں سے ہیں۔ اُنھوں نے نہ صرف سندھ کے اندر اپنے مستقل شہر قائم کئے بلکہ مشرقی ہندوستان تک بڑھ آئے اور اکثر موجودہ خاندان سادات انھیں علویین کی ذریات میں سے ہیں جو کسی وقت وادی سندھ میں آ کر ٹھٹا اور بھکر پر مستولی ہو گئے تھے۔

یہاں تک آپ کے پہلے سوال کا اور اسی کے ضمن میں چوتھے سوال کا جواب ہو گیا۔ دوسرے سوال کا جواب نہایت مختصر و آسان ہے، کیونکہ ہندوستان کی حکومت اسلامی حقیقتاً عربوں کی تاریخ سے بالکل جدا چیز ہے اور اس کا تعلق صرف ترکوں سے ہے۔ جنھوں نے وسط ایشیا سے نکلکر

مختلف ملکوں اور زمانوں میں اپنے فتوحات کے سیلاب سے دنیا میں ہنگامہ برپا کردیا اور ساری دنیا اس سے زیروزبر ہو گئی۔

تیسرے سوال کا جواب بہت اہم و تحقیق طلب ہے۔ اس لئے اجازت دیجئے۔ کہ فی الحال آپ سے رخصت ہوں اور ماہ آئندہ میں اسپر توجہ کروں۔

مروّت

ہم نے تو نہایت شوق سے اپنے باغ میں نارنگی کے درخت لگائے اور اُنکو ہمارے پڑوسی بھائی امجد کی بکری اس طرح چر گئی کہ اگر ہم نہ آجاتے تو جڑ بھی تناول فرماجاتی۔ اب اسوقت ہمارا دل تو یہی چاہتا ہے کہ بھائی امجد کو مارتے مارتے گرادیں۔ اور اُنکی بکری کے کباب بناکر تمام محلہ میں تقسیم کریں۔ یا اُسکو اتنا پیٹیں کہ وہ خود نارنگی کا درخت بن جائے۔ لیکن سوائے اس کے کہ دو ایک ڈنڈے لگا کر بکری کی ٹانگ توڑدیں۔ اور ہم سے کچھ نہیں ہوسکتا، یا ہمارے دوست آمین ہمارے گراموفون کو اپنی بیوی کے نام سے مانگ کرلے گئے، اور وہاں اس میں اتنی کوک بھردی کہ وہ ٹوٹ گیا۔ اب ہم اس کے سوا اور کیا کرسکتے ہیں کہ اُن سے اُس کی مرمت کے لئے کہیں۔ حالانکہ ہم کو نیا گراموفون لینا چاہیئے تھا۔ لیکن نہیں لے سکتے۔ اسی طرح سراج نے ہماری گھڑی کا شیشہ توڑدیا۔ لیکن ہم نے ان کا سر نہیں توڑا۔ اس لئے کہ ان سے مراسم تھے۔ اور یہ ذرا چھوٹی سی بات تھی کہ ہم چار آنہ کے شیشہ کے لئے اُن کا قیمتی سر توڑ دیتے لیکن اُنھوں نے فوراً دوسرا شیشہ لگوادیا حالانکہ ان کو نئی گھڑی یا گھڑی کے دام دینا چاہیئے تھے۔ سلطان نے ہماری بائیسکل میں ایسا روگ پیدا کردیا ہے کہ وہ ایک قسم کی موٹر سائیکل ہو کر رہ گئی ہے۔ یعنی اس کے مڈگارڈ چلنے میں "پھڑ پھڑ" ہوتے ہیں۔ لیکن ہم ان سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ نئی بائیسکل یا دو نئے مڈگارڈ بنواؤ۔ اس لئے کہ وہ کہدیں گے کہ میں نے دھجری لگوادی تھی اور ہم کو خاموش ہوجانا پڑے گا۔ بھائی جمیل کے لڑکے نے ہمارے قلم کا نب توڑدیا۔ لیکن ہمارے چہرہ پر ایک شکن بھی پیدا نہیں ہوئی۔ ورنہ سب یہی کہتے کہ بچے کی غلطی پر افسوس کرتے ہیں۔ بلکہ جب بھائی جمیل نے دوسرا نب لگایا۔ اسوقت بھی ہم سے یہ کہتے نہ بن پڑا کہ جو نب ٹوٹ گیا ہے وہ ایک پیسہ والا تھا اور جو لگ رہا ہے وہ اس سے بہت کم قیمت ہے۔

ہماری اس قسم کی باتوں کو لوگ مروت کہتے ہیں اور واقعی یہ مروت ہی ہے جس سے ہم شدید سے شدید نقصان اُٹھانے کے باوجود خاموش رہتے ہیں یہ ہم خوب جانتے ہیں کہ نئی روشنی یعنی موجودہ دور میں مروت "آؤٹ آف فیشن" یعنی متروک ہو گئی ہے۔ لیکن جن لوگوں کی فطرت میں مروت داخل ہو چکی ہے جیسے ہم۔ وہ لوگ عیرارادی طور پر مروت کرتے ہیں اور نقصان اُٹھاتے ہیں۔ حالانکہ اسوقت کامیاب انسان وہی ہے جس میں مروت کا نام نہ ہو اور انتہائی بدقسمت وہ ہے جس کی آنکھوں میں مروت ہے۔ اب اگر ہم یہ چاہیں کہ اپنے کسی دوست کو ایک رقم قرض دیکر معہ سود در سود واپس لے لیں تو یہ ہمارے لئے ناممکن ہوجائے گا۔ ہم مروت سے مجبور ہو کر اصل رقم بہت خفیف منافع کے بعد لیکر خاموش ہو رہیں گے لیکن اگر کوئی ایسا شخص جس میں مروت نہ ہو اپنے باپ کو بھی کچھ قرض دیگا تو اصل رقم کی سہ گنی وصول کرے گا اور جبتک وصول نہ ہوجائے گی اتنے تقاضے کرے گا کہ بیچارے قرضدار کو کسی اور سے قرض لیکر ان حضرت سے جان چھڑانا پڑے گی۔

یہ مضمون مکمل اور اسی قسم کے اور بہت سے دلچسپ مضامین دیکھنا ہوں تو "موجِ تبسم" (مجموعہ مضامین شوکت تھانوی) ہم سے طلب کیجیئے۔ قیمت معہ محصول دو روپیہ (۲؍) جلد سُنہری۔ **مینیجر نگار۔ لکھنؤ**

محبت

سمندر کی فضا، کفِ در دہاں، موجیں لرزاں ہے
بپا ہیں، چارسو، ہمت شکن، محشر صداؤں کے
گرج ہے بادلوں میں، بجلیاں پیہم کڑکتی ہیں
شکوہ جنبشِ امواج سے دل کانپ جاتے ہیں
گرج، شور ہوا، بجلی کے کڑکے، جوششِ تاریکی
خروش ابر ہے ہنگامہ افگن، آسمانوں سے
گرفت بادِ طوفانی ہے، یکساں ماہ و ماہی پہ
زمیں پہ اسطرف، امواج طوفانی ہیں، محشر ہے
پریشاں ہے، حیاتِ منضبط، اجزائے طوفانیں
جہاز اک منتشر سا جا رہا ہے، قلبِ دریا میں
کبھی موجیں اٹھا کر سوئے گردوں، لیگئیں اسکو
وہ جنبش ہے کہ ٹکڑے اڑ گئے ہیں، بادبانوں کے
جھکولے پہ جھکولے دے رہی ہے، بادِ موج افزا
بھڑکتی آگ سے کچھ شعلۂ مضطر لپکتے ہیں
مسافر زرد ہیں، باقی نہیں دم ناتوانوں میں
شکایت بھی تو ان سے ہو نہیں سکتی نصیبوں کی
معاذ اللہ! وحشت خیز کتنی یہ گھڑی بھی ہے
پتہ کچھ سمت منزل کا، نہ کچھ احساس منزل ہے
غرض چھایا ہوا ہے اس قدر خوف پریشانی

بھیانک رات کی تاریکیاں ہیں، شورِ طوفاں ہے
چلے آتے ہیں، ہیبت ناک، سرائے ہواؤں کے
لبِ ساحل "قلب ترساں" دہر کی نبضیں پھڑکتی ہیں
کہ یہ کوہِ گراں، وحشِ ہوا پہ اڑتے آتے ہیں
یہ کھلتا ہے کہ گرم کارہے اک جنگ بربادی
صدائے ہول یا آتی ہے توپوں کے دہانوں سے
تلی ہیں قہرمانی قوتیں، تکسیر تباہی پہ
ادہر اوجِ فلک سے بارشِ ہنگامہ پرور ہے
جڑیں ہلتی ہیں، دنیا کی ہجوم باد و باراں میں
کوئی تنکا، ہے یا امواج کے اس حشر برپا میں
کبھی گرداب نے چاہا، کہ کردے تہ نشیں اس کو
یہ عالم ہے کہ دل ہلتے ہیں شیر افگن جوانوں کے
گماں ہے ناخدا کا ہر قدم پہ یہ کہ اب ڈوبا
یہ موجیں ہیں کہ منہ کھولے ہوئے اژدر لپکتے ہیں
کہ یہ سہمے ہوئے، بیٹھے ہیں، طائر آشیانوں میں
لہو شاید رگوں میں جم گیا ہے ان غریبوں کی
زبانیں بند، مرگ ناگہاں آنکھوں میں پھرتی ہے
نظر، لبریز غم، سینے میں اک ڈوبا ہوا دل ہے
کہ عجز نامرادی بن گئی ہے عقلِ انسانی،

ادھر یہ "عالمِ تخریب" ہے بیدار طوفاں میں
یکایک سازِ غم سے نغمۂ عشرت نکلتے ہیں۔
وہ دیکھو نور کی اک رَو زمیں سے آسماں تک ہے
سرودِ زندگانی، ذرہ ذرہ اب، سُناتا ہے
نہ اب وہ جوش ہے، بپھری ہوئی امواجِ طوفانی
نہ ہمت آزما بجلی کے کوندوں کا وہ عالم ہے
جہاز اب سطحِ دریا پر رواں ہے بخطیمہ ہو کر
ربابِ عیش ہے، ہر موج رقصاں، شادمانی سے
نئے انداز سے عشرت فشاں جلوے بکھرتے ہیں
فضا میں، بادلوں کے پاس، اک حلقہ ہے نورانی
صدائیں روح پر گونجتی ہیں، امن و راحت کی
محبت ہی یہاں صرف ایک رازِ کامرانی ہے

اُدھر فطرت کہ ہے گرمِ عمل تعمیرِ دوراں میں
ہوائیں جھوم جاتی ہیں یہ نظارے بدلتے ہیں
بہار جلوہ گر، بستانِ ہستی سے جناں تک ہے
یہ عالم ہے کہ ہر گوشہ زمیں کا مُسکراتا ہے
نہ اب وہ زور ہے ہنگامہ پرور باد و باراں میں
نہ وہ عفریتِ پیکر بادلوں کا شورِ پیہم ہے
فسانہ رہ گیا طوفاں کا آخر مختصر ہو کر
ترانے اُٹھ رہے ہیں دلنشیں دھیمی روانی سے
چمن بیدار ہوتے ہیں، ستارے وجد کرتے ہیں
مہ و خورشید کو شرما رہی ہے جسکی رخشانی
کہ اس حلقے میں ہے نور آفریں دیوی محبت کی
کہ طوفاں خیز عالم اور جہازِ زندگانی ہے

سید علی اختر اختر

مغربی پھول

دیکھا جو میں نے دور سے مسحور ہو گیا
کیفیتِ نظارہ سے مسرور ہو گیا

جی چاہتا تھا تیری نزاکت کی داد دوں
رنگت کی داد دوں تری صورت کی داد دوں

اس وضع شاندار کا مدحت سرا بنوں
اس حُسنِ باوقار کا مدحت سرا بنوں

لکھوں قصیدہ تیرے تناسب کا شاندار
تیری ادا ادا پہ دل و جاں کروں نثار

منہ تیرا جھک کے فرطِ محبت سے چوم لوں
"تجھکو بٹھا کے سامنے یادِ خدا کروں"

سونگھا جو بڑھ کے دل میں پشیماں سا ہو گیا
فقدانِ بُو سے قلب پریشاں سا ہو گیا

مغرب کے پھول! تجھ میں نزاکت ہے بو نہیں
میرے مشامِ جاں کو تری آرزو نہیں

رنگِ نظر فریب پہ بھولا ہوا ہے تو
اک برقِ بانمود پہ بھولا ہوا ہے تو

آں گُل کہ بوئے خوب ندارد عزیز نیست
دلبر کہ خوئے خوب ندارد عزیز نیست

ایمن حزیں

سرود نیم شبی

(۱)

یہ رات بلا خیز، یہ پر ہول فضائیں
ظلمت کی قبائیں
پہنے ہیں ہوائیں
گاتی ہیں گزرتی ہوئی غمناک نوائیں
ہر سمت ہیں گونجی ہوئی وحشت کی صدائیں
کرتی ہے اجل دور سے ہنس ہنس کے اشارے
رقصاں ہیں مرے دل میں محبت کے شرارے

(۲)

اس نیم شبی کیف میں اب نیند کی پریاں
ہیں مست خراماں
رخ سوئے شبستاں
ملتی ہیں نظرخانہ میں سب خواب کا داماں
ہنستا ہے کوئی سوتے میں، کوئی ہے پریشاں
بیٹھا میں غرض دیکھ رہا ہوں یہ نظارے
رقصاں ہیں مرے دل میں محبت کے شرارے

(۳)

گل ہنستے ہیں کھولے ہوئے اپنا رخ رنگیں
یہ لالہ و نسریں
رشک مہ و پرویں
نکہت سے صبا کہتی ہے افسانۂ غمگیں،
شبنم کے لئے کھولے ہے نکہت در زریں
تاریک فضاؤں میں ہیں چمکتے ہیں ستارے
رقصاں ہیں مرے دل میں محبت کے شرارے

(۴)

ڈوبی ہوئی اک کیف کے عالم میں ہے دنیا
یا مستی صہبا
چھائی ہے ہر اک جا
سب ڈوب گئے خواب میں اے جانِ تمنّا
تو آکے سرِ بام ہو اب محوِ تماشا
آتی نہیں نیند آہ مجھے رنج کے مارے
رقصاں ہیں مرے دل میں محبت کے شرارے

(۵)

نکہت سے صبا ملتی ہے، اور پھول سے شبنم
کس جوش میں باہم
مستانہ و بے غم
سورج کی کرن ملتی ہے شبنم سے سحر دم
موجیں لب ساحل سے ملا کرتی ہیں پیہم
ملتا نہیں کیوں مجھ سے تو اے آنکھ کے تارے
رقصاں ہیں مرے دل میں محبت کے شرارے

(شمیمی بی۔ اے)

یادِ ایام

(۱)

کہاں وہ دن کہ جب پہلو میں دل تھا!
تصورِ محوِ حیرت تھا فلک پر!
کہاں وہ دن کہ جب دل میں تڑپ تھی!
تخیل کی عناصر سے جھڑپ تھی!

(۲)

کہاں وہ دن کہ جب پہلو میں دل تھا!
گدائے نور تھے انجم مہ و مہر!
کہاں وہ دن کہ جب دل میں ضیا تھی!
خدا جانے وہ شمعِ بزم کیا تھی!

(۳)

کہاں وہ دن کہ جب پہلو میں دل تھا!
حریمِ ناز تھی میری کفِ خاک!
کہاں وہ دن کہ جب دل میں سحر تھی!
شبِ دیجور کی کس کو خبر تھی!

(۴)

کہاں وہ دن کہ جب پہلو میں دل تھا!
مرے نالوں میں تھا اک عالمِ سوز!
کہاں وہ دن کہ جب دل میں خلش تھی!
رگِ جانِ حزیں وقفِ تپش تھی!

امین حزیں

اک لمحۂ حیات!

اُن کے ہونٹوں پر تبسم ہو نہایت بے حجاب
ہو گیا شاید مرا حالِ تباہی کامیاب
یہ مری مایوسیاں اور اسقدر ہنگامہ خیز
یہ مری ناکامیاں یا رب! اور اتنی کامیاب
میں اس اک لمحے کو عمرِ جاوداں سمجھا کیا
جس میں آیا اور رخصت ہو گیا عہدِ شباب

ساغر (نظامی)

غزلیات

(اظہر نعمانی)

تابکے اے ہم نفس خونِ تمنا کیجئے
بیزباں بن جایئے اور ان کو دیکھا کیجئے

گھٹ رہی ہے گوشۂ دلمیں تمنائے جمال
آپ یوں مشتاق نظروں سے نہ پردا کیجئے

تاب نظارہ کہاں ہے صورتِ چشم کلیم
محوِ حیرت کو نہ ممنونِ تماشا کیجئے

المدد اے نالۂ دل ضبط کی حد ہو چکی
خود بھی رسوا ہو جیئے انکو بھی رسوا کیجئے

ہے ترحم کی ادا طرز تغافل کے خلاف
وعدۂ باطل کو کیوں مرہونِ ایفا کیجئے

عرضِ مطلب سنکے پڑجاتی ہو ماتھے پہ شکن
روبرو انکے نہ چپ رہیئے تو پھر کیا کیجئے

خود سکونِ قلب وجہ انتشارِ قلب ہے
زندگی بے کیف ہے پھر درد پیدا کیجئے

حیلہ جوئی ہے شعار انکا تو اظہر کس لئے
انتظار وعدۂ امروز و فردا کیجئے

(جگر بریلوی)

لیجئے تابانیٔ عالم کے ساماں ہو گئے
دل کے ذرے اڑکے ہرجانب پریشاں ہو گئے

فرطِ تنہائی سے مرجانا تو کچھ مشکل نہ تھا
کیا کہیں غم سے مگر کچھ عہد و پیماں ہو گئے

اب میں سمجھا سینۂ سوزاں کے شق ہونیکا راز
آپ پنہاں کیا ہوئے گویا نمایاں ہو گئے

جن کو ہونا ہی نہ تھا راہِ محبت میں غبار
کسطرح وہ خاک کے پتلے پھر انساں ہو گئے

صحبت احباب میں حاصل ہوا وہ لطفِ نسبت
آج ہم بھی قائلِ فردوسِ رضواں ہو گئے

حسن نے روزِ ازل جب رخ سے سرکائی نقاب
چند جلوے رنگ بنکر بزمِ امکاں ہو گئے

رفتہ رفتہ آرزوئے رستگاری مٹ گئی
رہ کے زنداں میں جگر آزادِ زنداں ہو گئے

(سنجر عظیم آبادی)

بیدار کر تو جلوۂ بے انتہا مجھے
ہے خواب زندگی ستم ناروا مجھے

اے کیف بیخودی ترے صدقے ہزار ہوش
رگ رگ میں پھر رہا ہی کوئی ڈھونڈتا مجھے

دُہرا رہا ہوں قصۂ ہستی کو بار بار
ملتا نہیں ہے دہر میں میرا پتا مجھے

ہر شوق بزم ناز میں ایذا پسند ہے
مرنے نہ دیگی حشر میں تیری ادا مجھے

وہ صورتِ مجاز میں شاید ہو جلوہ گر
اے دل اسی امید پہ جینا پڑا مجھے

دلتنگی زمانہ سے امید واریاں
اس وسعتِ خیال نے رسوا کیا مجھے

صبحِ وطن کے جلوۂ پنہاں ہیں منتشر
کس نے یہ خواب زیست سے چونکا دیا مجھے

حیراں کئے ہے محفل ہستی میں ایک ایک
سنجر یہ عکس آئینہ خودنما مجھے

(شاد صابری)

نہ پہونچا ہے نہ پہونچیگا تصور تک ہاں اپنا
جہاں جلوہ نہیں نظریں ڈھونڈھتی ہیں آشیاں اپنا

اگر ملتی مجھے آزادئ فکر تصور بھی
قفس کے سامنے تعمیر کرتا گلستاں اپنا

نہ دے تکلیفِ اظہارِ حقیقت اے دلِ ناداں
میں جبکہ راز ہوں وہ آپ ہی ہے رازداں اپنا

وہیں کھولی ہے چشم ضبط میری سوزش دل نے
مقید تھا جہاں نظارۂ جوشِ نہاں اپنا

فضائے لامکاں تو آگئی، پرواز اب کبتک
دکھا اے طائر حسن تصور، آشیاں اپنا

ضعیفی نے مٹا دی طاقت و تاب و تواں یا لکل
کہاں لوٹا گیا اللہ اکبر کارواں اپنا

درِ مقصود پہ لاکھوں سجودِ شوق ادا کرکے
جبینِ شوق کو اے شاد سمجھا آستاں اپنا

(شباب بدایونی)

کیا سمجھکر شکوہ سنجِ اضطرابِ دل ہوں میں
ناز ہے مجھکو کہ جورِ دوست کے قابل ہوں میں

کام آتی ہیں زمانے کے مری ناکامیاں
دیدۂ عبرت طلب کی سعی کا حاصل ہوں میں

دیکھ یہ آنکھوں سے ٹپکے اشکِ خوں اے چارہ گر
ترکِ عشق اچھا ہے لیکن کیا اب اس قابل ہوں میں؟

کم نگاہی نے تری کھویا مگر ذوقِ نظر
یوں تو ہونے کو لئے ہوں اور سرِ محفل ہوں میں!

کیا کہوں کیا کیا تھپیڑے دے رہی ہے موجِ غم
آکے ساحل پر بھی وقفِ حسرتِ ساحل ہوں میں

ایک مجبورِ الم کی ہائے یہ ناکامیاں
جان دینے کو بھی وقفِ منتِ قاتل ہوں میں

چارہ گر اب درد کو حد سے گزر جانے بھی دے
رحم کر مجھ پر کہ جویائے سکونِ دل ہوں میں

پیش و پس اب کس لئے راہِ طلب آسان ہے
مژدہ اے دل بے نیازِ خطرۂ منزل ہوں میں

ہو بھی تو دل سے کوئی سرگرمِ سعیِ جستجو
یوں اُٹھے شوقِ طلب خود رہبرِ منزل ہوں میں

بے وفا سے کر رہا ہوں شکوۂ فرقتِ شباب
وائے ناکامی کہ محوِ سعیِ لاحاصل ہوں میں

(سید محمد عمر شمس حیدرآبادی)

فلک بھی کانپتا ہو جس سے میں وہ آہِ بسمل ہوں
مری فریاد سے ڈرنا کہ میں ٹوٹا ہوا دل ہوں

مری وارفتگی ہی میری بربادی کا باعث ہے
میں اپنے حق میں گویا خود ہی اک زہرِ ہلاہل ہوں

سراپا اک نگاہِ یاس ہوں اس بزمِ ہستی میں
نہ اُبھرا جو کسی صورت سے وہ بیٹھا ہوا دل ہوں

حیات اور موت کی تصویر ہے رودادِ الفت کی
کبھی زندوں میں شامل ہوں کبھی مردوں میں داخل ہوں

عجب پُر کیف حالت ہے کہاں جھگڑے مَن و تُو کے
بھُلا دے دل سے جو دنیا کو وہ محویتِ دل ہوں

خودی نے پردۂ غفلت مری آنکھوں پہ ڈالا ہے
مآلِ کار سے جو بے خبر ہے میں وہ غافل ہوں

نہ تاب ضبط ہے دل کو نہ یارائے فغاں مجھ میں
درائے کاروانِ یاس ہوں، گم کردۂ منزل ہوں

اُمیدیں مجھ سے ٹکرا کر پلٹ جاتی ہیں حسرت سے
میں اس بحرِ حوادث میں لبِ خاموشِ ساحل ہوں

یہ ہستی شمس میری کیا سراپا ننگِ ہستی ہے
نہ میں دنیا کے لائق تھا نہ میں عقبیٰ کے قابل ہوں

(رئیس شیروانی)

راہِ الفت میں سکوں کیسا کہ منزل دور ہے
ہاں ابھی انجامِ کارِ حسرتِ دل دور ہے

ہو نہ جائے کشتیٔ دل رہنِ گردابِ فنا
موجزن دریائے بیتابی ہے ساحل دور ہے

یہ فریبِ جذبِ دل ہے یا طلسمِ آرزو — جان سے نزدیک بتے ہیں مگر دل دور ہے
حسرتِ دل رہروانِ عشق کی ہے دید نی — راستہ ہمت شکن ہے اور منزل دور ہے
کیوں ہجوم یاس و حسرت گوشہ گیرِ دل نہ ہو — قطع ہے دستِ طلب، دامانِ ساحل دور ہے

قیس ہے دامن کشاں سوئے لیلائے اُمید
جبکہ آوازِ جرس کہتی ہے محمل دور ہے!

(محمود الہ آبادی)

ہاں جنوں انگیز اتنا نعرۂ مستانہ تھا — ذرّے ذرّے میں جہاں کے کیفِ مجنونانہ تھا
اضطرابِ دل سے پیر پاؤں تک اُٹھتے نہ تھے — میں کھڑا تھا سامنے اور در وا در جانا نہ تھا
اُسکے ایک اک لفظ پر سب اہلِ دل روتے رہے — درد و غم میں اسقدر ڈوبا ہوا افسانہ تھا
روح کو کیونکر پلاتا بادۂ ذوقِ نشاط — ساغرِ دل میرا اک ٹوٹا ہوا پیمانہ تھا
ذرّہ ذرّہ کر رہا ہے رقصِ بزمِ دہر کا — اللہ اللہ کس بلا کا نعرۂ مستانہ تھا

یہ بھی اک اعجاز تھا محمود وحشت کا مری
جسطرف آنکھ اُٹھ گئی ویرانہ ہی ویرانہ تھا

(ناطق جیلانی کلاوٹھوی)

ہمیں جو یاد ہے ہم تو اُسی سے کام لیتے ہیں — کسی کا نام لینا ہو اُسی کا نام لیتے ہیں،
ابھی ہم جان دیکر سوئے ہیں ہم لیکے اُٹھینگے — نہ چھیڑ اے شورِ محشر ہٹ ذرا آرام لیتے ہیں
نکل جاتے ہیں جب وہ ہاتھ آکر کیا کہیں دل کی — نکل جاتا ہے جب دامن کلیجہ تھام لیتے ہیں
کسی نے کیا کہا ہم کیا بتائیں یہ تو دنیا ہے — ہزاروں نام رکھتے ہیں ہزاروں نام لیتے ہیں
نہیں لینا ہے کچھ جاکر اگر بازارِ ہستی میں — تو اچھا لاؤ دیدو ہم دلِ ناکام لیتے ہیں

غضب ہے ناکہ اُن کو شرم بھی آتی نہیں ناطق
ڈبو کر نام جو اپنے بڑوں کا نام لیتے ہیں،

مطبوعاتِ موصولہ

موج تبسم جناب شوکت تھانوی کے بعض مضامین کا مجموعہ ہے جسے بجائے "طوفانِ تبسم" یا "سیلابِ تبسم" کے "موجِ تبسم" کے نام سے جناب نسیم انہونوی نے شائع کیا ہے۔ ممکن ہے لفظ موج کی تعیین کی نسیم صاحب نے خود اپنے نام کی لطافت و نزاکت کا لحاظ رکھا ہو۔

شوکت تھانوی اُن چند مخصوص مزاحیہ نگاروں میں سے ہے جن کے ذکر سے اُردو لٹریچر کی تاریخ خالی نہیں ہو سکتی۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ جو مزاح شوکت کے مضامین میں پایا جاتا ہے وہ الیاذم، لطیف و سُبک ہے کہ کسی اور جگہ پایا ہی نہیں جاتا۔

جس طرح شاعر پیدا ہوتا ہے اُسی طرح مزاحیہ نگار بھی بنتا نہیں۔ لیکن اُسی کے ساتھ یہ بھی ہے کہ جسطرح ایک شاعر فرطِ احساس یا ماحول کے اثرات سے بگڑ کر مرثیہ گو ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایک مزاحیہ نگار بھی ادنیٰ بے احتیاطی سے مسخرا بن جاتا ہے۔ چنانچہ ملک کے موجودہ مزاحیہ نگاروں میں سے بعض اسی مصیبت میں مبتلا نظر آتے ہیں جسطرح بعض لکھنوی غزل گو، مرثیہ نگاری کے عذاب میں گرفتار ہیں۔

مزاحیہ نگاری حقیقتاً تنقید کی ایک قسم ہے اور میرے خیال میں بہترین قسم کی ہے۔ چونکہ اس رنگ کے لکھنے والے کی "تلخ گفتاریاں" ہمیشہ خوشی سے برداشت کر لیجاتی ہیں۔ اس لئے "شخص مجروح" کو بھی سمجھنے اور انصاف کرنے کا موقعہ ملجاتا ہے اور بات کہیں سے کہیں نہیں پہونچتی۔

مزاحیہ نگاری حقیقتاً ایک مستقل موضوع ہے، جس پر اصولاً، تاریخاً اور روایتاً بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے، لیکن اس کا موقع موجِ تبسم کے تنقید کے سلسلہ میں نہیں ہے۔ تاہم اس قدر عرض کر دینا ضروری ہے کہ شوکت تھانوی کی یہ کتاب آپ جس نگاہ سے بھی دیکھیں گے قابلِ قدر نظر آئے گی۔

ہر چند نگار میں اسوقت تک شوکت صاحب کا کوئی مضمون شائع نہیں ہوا۔ لیکن ملک کے مختلف رسائل میں اُنکے افکار شائع ہوتے رہتے ہیں اور پورے لطف کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں۔ اس مجموعہ میں تقریباً ایک درجن مضامین ہیں، جن میں سے بعض غیر مطبوعہ بھی ہیں اور بلا استثناء سب کے سب پُر لطف ہیں۔

اس مجموعہ میں جناب نسیم کا ایک مقدمہ بھی شامل ہے اور خوب ہے۔ لیکن ان کی یہ ستم ظریفی ضرور قابلِ ذکر ہے کہ اُنھوں نے اس مجموعہ میں فہرست شامل نہ کر کے کم از کم مجھے ضرور اُس ریب و وہم میں مبتلا کر دیا کہ اگر کوئی

مجھ سے پوچھے کہ اس مجموعہ میں کتنے مضامین ہیں تو میں کبھی صحت کے ساتھ نہ کہہ سکوں گا۔

شوکت صاحب اور نسیم صاحب کی تصاویر بھی اس مجموعہ میں شامل ہیں۔ جس سے مقصود شاید اس ردعمل میں قوت پیدا کرنا ہے، جو "مزاحیہ صحبت" کے بعد کبھی کبھی از خود رونما ہوتا ہے، لیکن میں ناظرین نگار کو یقین دلاتا ہوں کہ ان دونوں حضرات کی صورت حقیقتاً ویسی نہیں ہے جیسی اُن کی تصویروں سے ظاہر ہوتی ہے۔

اس مجموعہ کی قیمت دو روپیہ معہ محصول ہے اور نگار بک ایجنسی سے مل سکتا ہے۔

شوپنہار

یہ ایک رسالہ ہے جسے نگار کے مشہور فسانہ نویس مجنوں گورکھپوری نے جرمنی کے مشہور فلسفی شوپنہار کے حالات اور اُس کے فلسفہ کی تنقید میں لکھا ہے۔ شوپنہار دورِ حاضر کے اُن فلاسفہ میں سے تھا جن کی نظیر تاریخ عالم میں بمشکل سے ملتی ہے۔ یہ فخر صرف شوپنہار ہی کو حاصل تھا کہ اس کی فلسفہ طرازیوں سے لوگوں نے شعر و شاعری کا سا لطف اُٹھایا۔

غالباً کم لوگوں کو اس حقیقت کا علم ہوگا کہ مجنوں نہ صرف افسانہ نگار ہیں۔ بلکہ وہ نہایت بلند فلسفیانہ ذوق بھی رکھتے ہیں اور یہ دونوں باتیں ان میں اسقدر حسن کے ساتھ ملی ہوئی ہیں کہ شوپنہار کی طرح ہم اُنکے متعلق بھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان دونوں میں سے کونسا عنصر ان میں غالب پایا جاتا ہے۔ اس لئے شوپنہار کے فلسفہ کو اُردو میں منتقل کرنیکے لئے مجنوں سے زیادہ اہل کوئی دوسرا شخص ہو ہی نہ سکتا تھا۔ مجھے حیرت ہے کہ فلسفہ کے خشک مباحث پر اُنھوں نے کسقدر شگفتگی و ادبیت کے ساتھ گفتگو کی ہے اور مجھے افسوس ہوگا اگر ساکب نے اس خصوصیت کا لطف حاصل نہ کیا۔ کتاب نفیس کتابت و طباعت کے ساتھ سنہری جلد میں، شائع ہوئی ہے اور شوپنہار کی تصویر بھی شامل کر دی گئی ہے قیمت عہ ہے اور ایوان اشاعت گورکھپور سے مل سکتی ہے۔ ۔ ۔ ۔ اور دفتر نگار سے بھی۔

موجِ تبسّم!

یعنی جناب شوکت تھانوی کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ جو حال ہی میں نہایت اہتمام کے ساتھ مجلد شائع ہوا ہے۔ قیمت معہ محصول (عہ)

اسی ماہ میں اڈیٹر نگار کی رائے اس کتاب پر ملاحظہ فرمائیے۔ منیجر نگار لکھنؤ

کیا آپ کو معلوم ہے کہ

ترجمہ تاریخ ادب اردو

چھپ کر تیار ہوگیا۔ جس سے زیادہ مکمل اور جامع زبان اُردو کی کوئی تاریخ نہیں۔ تمام مشاہیر نظم و نثر کے تذکرے اون کے کلام کے نمونے اور سو کے قریب مشہور ادیبوں کی تصاویر معہ ایک زبردست انڈکس کے اسمیں شامل ہیں بہت ضخیم ہے۔ دو حصہ مجلد نہایت خوشخط چھپائی و کاغذ نہایت دیدہ زیب قیمت لعہ مترجمہ مرزا محمد عسکری صاحب بی۔ اے۔

تذکرۃ الخواتین تمام شاعرہ عورتوں کی نہایت مختصر سوانحعمری اونکا کلام۔ حالات۔ ایرانی اور ہندوستانی دونوں جگہ کی صنف نازک کے کلام کا بےمثل اور لاجواب مجموعہ۔ اس سے زیادہ مواد اس بارہ میں کسی تذکرہ نسواں میں نہ ملے گا۔ مؤلفہ مصور درد مولوی عبدالباری صاحب آسی قیمت عہ چھپائی و کاغذ نہایت عمدہ۔

مذاہب الاسلام عجیب و غریب کتاب ہے گویا ایک دریا کو کوزہ میں بند کردیا ہے۔ یعنی اسلام میں جتنے مذہب اور جتنے فرقے اور جس فرقے کے جو عقیدے اور رسمیں ہیں۔ جس فرقے کا جو بانی ہوا ہے وہ سب اس میں نہایت واضح طور پر درج کئے ہیں۔ ممکن ہی نہیں کہ کوئی ایک صفحہ پڑھکر بغیر ختم کئے کتاب کو چھوڑدے۔ قیمت للعہ

دیوان خواجہ میر درد خواجہ میر درد کا درد و اثر بھرا کلام نہایت خوشخط معہ اعلےٰ رنگین خوشنما ٹائٹل کے اس میں ایک مقدمہ مولانا عبدالباری آسی کا شامل ہے جو حقیقتاً ایک لطیف اضافہ ہے۔ اوسمیں خواجہ صاحب کے شاگردوں کے حالات و کلام کا نمونہ بھی دیا گیا ہے۔ قیمت ۱۲ار

دیوان خواجہ آتش اس مرتبہ دیوان کو نہایت عمدہ کاغذ پر بعد صحت و صفائی کے بعد چھاپا گیا ہے۔ قیمت عہ
دیوان ذوق ۱۲ار دیوان غالب معہ اضافہ کلام جدید ۸ر کلیات ناسخ بطرز جدید عہ

مینیجر نولکشور پریس صیغہ بک ڈپو لکھنؤ